کھلے دریچے سے
فروغ فرخ زاد
ترجمہ:
فہمیدہ ریاض

کھلے دریچے سے

(انتخابِ کلام)

فروغ فرخزاد

ترجمہ

فہمیدہ ریاض

وعدہ کتاب گھر
عورتوں کی تحریروں کا اشاعتی ادارہ

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

کھلے در یچے سے

سن اشاعت: ۱۹۹۸ء

ناشر: وعدہ کتاب گھر، ۱۴۱-ڈی- بلاک ۲ پی ای سی ایچ ایس- کراچی، فون ۴۵۳۹۷۴۱

سرورق: منصور اے

"کھلے در یچے سے" کے لیے فروغ فرخزاد کے مندرجہ ذیل مجموعوں سے انتخاب کیا گیا ہے۔

۱۔ "اسیر" ۱۹۵۲ء شاعرہ کے انیس سے اکیسویں برس تک کا کلام۔
۲۔ "دیوار" ۱۹۵۳ء بائیس سے چوبیس برس تک کا کلام۔
۳۔ "عصیاں" ۱۹۵۹ء شاعرہ کے چھبیسویں برس تک کا کلام۔
۴۔ "تولدِ دیگر" ۱۹۶۶ء شاعرہ کے انتیسویں برس تک کا کلام۔
۵۔ "ایمان بیاوریم" شاعرہ کے بتیسویں برس تک کا کلام۔

(وعدہ کتاب گھر ادارہ "آج" کا شکر گزار ہے جن کے بیش بہا تعاون کے بغیر یہ کتاب تخلیق نہیں ہو پاتی۔)

شاعری میرے لیے ایک ایسا دریچہ ہے جس کی جانب جب میں جاتی ہوں تو خود بخود کھل جاتا ہے میں اس دریچے میں بیٹھتی ہوں، گردوپیش پر نظر ڈالتی ہوں، آواز دیتی ہوں، فریاد کرتی ہوں، آنسو بہاتی ہوں اور درختوں کے عکس میں گھل مل جاتی ہوں۔ اور میں جانتی ہوں کہ دریچے کے اس پار ایک فضا ہے اور کوئی شخص ہے جو میری بات سن رہا ہے۔ ایک شخص جو ممکن ہے ۲۰۰ برس پہلے وجود رکھتا ہو یا ۲۰۰ برس بعد پیدا ہوا۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

فروغ فرخزاد

(ایرانی ادبی مجلہ "آرش" میں فروغ کے انٹرویو سے اقتباس)

ادارے کی جانب سے
یہ مجموعہ
فنونِ لطیفہ سے وابستہ ہر عورت کے نام

میں ان لوگوں سے بچتی ہوں
جو میرے شعر سنتے ہیں
تو میرے سامنے یوں مسکراتے ہیں
کہ جیسے پھول خوشبودار ہوں ___ لیکن
مرے پیچھے عجب باتیں بناتے ہیں
مجھے دیوانۂ بدنام کہتے ہیں
جو میرے ہمدم و ہم رنگ بنتے ہیں
پہ خلوت میں حقارت سے
ہزاروں تہمتیں مجھ پر لگاتے ہیں

فروغ فرخزاد

(رمیدہ۔اسیر)

فہرست

تولد دیگر

ایماں بیاوریم

فروغ فرخزاد

(تعارف)

وہ عظیم تھی
وہ عصر حاضر کی شخصیت تھی
تمام کھلے آفاق سے اس کا واسطہ تھا
وہ آب و گِل کی راگنی کو خوب سمجھتی تھی
(فروغ کی موت پر ایرانی شاعر بہروز جلالی کے مضمون کی اوّلیں سطریں)

اس صدی کے وسط میں فروغ فرخزاد جولانگاہ ادب میں ایک شعلہ جوالہ کی مانند بلند ہوئی اور عین عالم جوانی میں جبکہ اس کی تمام صلاحیتیں منتہائے عروج پر تھیں، کار کے ایک حادثے میں اچانک ختم ہو گئی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف ۳۲ برس تھی۔ اس نے باقاعدہ شعر گوئی اٹھارہ انیس سال کی عمر میں شروع کی تھی لیکن اس مختصر عرصے میں اس کے شعری جوہر نے ایران کے ادبی منظر کو خیرہ کر دیا تھا۔ ادیب اور دوسرے قارئین انگشت بدنداں تھے کہ اس اقلیم میں ایک نوجوان عورت اچانک کس طرح نمودار ہوئی اور چھاتی چلی گئی۔ اس کے کلام کی سحر بار نغمگی اور حسن، اس کا حیرت انگیز بے جھجک نسوانی اظہار، اس کی جرات اور خوداعتمادی اور انتہائی کھری سچائی جگر میں اترنے والی تاثیر کے ساتھ پڑھنے والوں کو مبہوت کر رہا تھا۔

مختصر حالاتِ زندگی

فروغ فرخزاد ۱۹۳۵ء میں تہران میں کرنل فرخزاد کے گھر پیدا ہوئی۔ وہ تیرہ چودہ برس کی عمر میں خوب غزلیں کہتی تھی مگر بعد میں اس نے غزل گوئی ترک کر دی۔ ہائی اسکول کے بعد اس نے کچھ عرصہ مصوری اور سلائی کی تربیت بھی حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر میں اسے خود سے پندرہ سال بڑے ایک دور کے رشتے دار پرویز شاپور سے عشق ہو گیا اور اس نے ماں باپ سے ضد کر کے شادی کرلی اور شاپور کے ساتھ اہواز چلی آئی۔ ایک سال کے بعد اس کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام "کامیار" رکھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی شعر و سخن سے دلچسپی بڑھتی گئی اور اس کی ذہنی پختگی میں اضافہ ہوا۔ اس کا شوہر شاپور اس کی شاعری میں عشق کے بے باکانہ اظہار کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے اسے طلاق دے کر اس کا بچہ بھی اس سے چھین لیا جسے پھر شاپور اور اس کے خاندان والوں نے زندگی بھر فروغ سے ملنے نہ دیا فروغ نے بچے کے حصول کے لیے مقدمہ بھی لڑا مگر عدالت نے بچے کو باپ کے حوالے کر دیا۔

فروغ اپنے باپ کے پاس تہران واپس آ گئی مگر کچھ عرصے بعد تنہا رہنے لگی۔ اس نے بیرون ملک سفر کیا اور اطالوی، جرمن فرانسیسی اور بعد میں انگریزی میں اچھی استعداد حاصل کرلی۔ اس دوران وہ شعر لکھتی اور شائع کرواتی رہی۔ ۱۹۵۷ء میں فروغ ایران کی فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئی اور ۱۹۵۹ء میں فلم کی تربیت حاصل کرنے کے لیے برطانیہ میں ایک سالہ کورس کیا۔ جذامیوں پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنانے کے لیے وہ تبریز گئی تو وہاں اس نے ایک بچہ گود لے لیا اور اسے تبریز سے تہران لے آئی جہاں بچہ فروغ کی والدہ کے پاس رہتا رہا۔ ۱۹۶۶ء میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے فروغ فرخزاد ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی۔

فروغ کی مختصر سی زندگی جو آج ہمیں شاید غیر معمولی نہ معلوم ہو پچاس اور ساٹھ

کے عشرے میں ایرانی رسم و رواج سے طوفانی بغاوت سے عبارت ہے۔ فروغ کی گھریلو زندگی، پیشہ ورانہ مصروفیات اور شاعری سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد اور ثابت قدم عورت تھی جس نے معاشرے کے طے کردہ محفوظ راستوں پر چلنے کے بجائے اپنا راستہ حیرت انگیز ذہنی آزادی کے ساتھ منتخب کیا۔

اگرچہ فروغ کے اشعار میں رچے ہوئے غم والم سے یہ گمان ہوتا ہے کہ عورت کی بغاوت کا انجام صرف ایسی ہی ناکامی اور نامرادی کی زندگی ہے مگر اس کی زندگی کسی زاویے سے ناکام نہیں تھی۔ شاعری میں اس نے ایک نیا دبستان تخلیق کیا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ہر نئے مجموعے کی اشاعت بلکہ اس کی ہر نئی نظم کی اشاعت ایک قابلِ ذکر واقعہ بن جاتی تھی۔ دنیائے شعر میں وہ نہایت کم عمری ہی میں کامرانیوں کے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس طرح اس نے جن فلموں کی تدوین کی انھیں پے درپے بین الاقوامی میلوں میں انعامات ملے۔ مگر اس کامیابی کے باوجود فروغ فرخزاد کی شاعری میں موجود بےقراری و کرب کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی آزادی اور بغاوت کی قیمت اپنے خونِ جگر سے ادا کی۔

درخشندہ شاعری

فروغ نے اپنی شاعری کے پانچ مجموعے شائع کیے۔ "اسیر"، "دیوار"، "عصیاں"، "تولد دیگر" اور "ایمان بیاوریم" اس کی شاعری میں اس کے گہرے مشاہدے، وارداتِ قلبی کی شدت اور اس کی فکر کی مسلسل ارتقا سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروغ نے انتہائی بے باکی اور سچائی سے وہ کچھ قلم بند کیا جو اس کے دل پہ گزری۔ سولہ سترہ سال کی کم عمری ہی میں اس نے اپنی سیکسوالٹی کو دریافت کیا اور اپنے کلام میں دنیا اور زندگی کی نسائی تفہیم کی جو شعروادب میں مردوں کی اجارہ داری کے تناظر میں حیرت انگیز تھا۔

فروغ فرخزاد کو فطرت سے ایسی گہری محبت اور عقیدت تھی جیسی مذہبی لوگوں کے دل میں خدا کے لیے پائی جاتی ہے۔ تعلق زن و مرد کو بھی اس نے فطرت کا حصہ سمجھ کر دیکھا ہے۔ اس کے کلام میں جابجا بوسوں اور ہم بستری کا ذکر بھی ہے اور پاکی اور ناپاکی کے تصورات بھی بار بار آتے ہیں۔ اس کے نزدیک بھرپور وصل وہ مقدس عمل ہے جو اسے ناپاکی سے نجات دلا کر اور اس کے اندر موجود اس کی فطری پاکیزگی کو اجاگر کر کے اسے مائل بہ روحانیت کر دیتا ہے۔ اپنی نظم "عاشقانہ" میں وہ محبوب سے کہتی ہے۔

اے تشنج لذتوں کے جسم میں
خط ترے تن کے مرا ملبوس ہیں
جس طرح دھوتی ہے بارش جسمِ خاک
کر دیا آلودگی سے مجھ کو پاک

یا "وصل" میں

میں نے دیکھا
اس کے ہاتھوں کی روانی میں
میرے وجود کی جسمیت تحلیل ہو رہی تھی

ان اشعار میں شاعرہ نے جس باریک بینی سے عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل اہم نفسیاتی حقائق کی نشان دہی کر ڈالی ہے کہ چاہے جانے کے احساس سے انسانی قلب کی طہارت ہو جاتی ہے اور جسمانی لذت کے عروج پر مادی بدن محض احساس بن کر رہ جاتا ہے وہ فروغ کی بے پناہ ذہانت اور وجدان کی حیران کن مثالیں ہیں اور شعری حیثیت سے وجد آور بھی ہیں۔

نسائیت فروغ کی شاعری کا جوہر اصالت ہے۔ اس بے مثال شاعرہ نے جس اوجِ کمال، جرات اور سچائی سے نازک نسوانی احساسات کو قلم بند کیا ہے وہ اسے ایک

تاریخی حیثیت عطا کر چکا ہے۔ اس کی تحریر میں ہمیں بالخصوص مشرقی عورت کا چہرہ نظر آتا ہے کیوں کہ وہ جس درد و کرب سے گزرنے کی روئداد بیان کرتی ہے وہ مشرقی رسوم و قیود ہی کی پیداوار ہے۔ فروغ انتہائی معصومانہ بے تابی کے ساتھ ان رسوم و قیود کو توڑتے ہوئے اپنے جنسی تجربات کو بیان کرتے ہوئے کہہ دیتی ہے کہ "گنہ کردم، گناہ پُرزلذت" جو ایک ایسا طاقتور نعرہ بغاوت ہے جسے نسوانی اظہار کی صدیوں پر محیط جدوجہد میں سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فروغ بدنام ہوجاتی ہے، اسے اس کی مرضی کے خلاف طلاق دے دی جاتی ہے۔ اسے آوارہ قرار دے کر اس کا بچہ بھی ہمیشہ کے لیے اس سے چھین لیا جاتا ہے۔ اس عالم میں اس کی تنہائی کس قدر شدید تھی اور دل کس طرح خون ہو رہا تھا یہ نقشہ فروغ نے اپنی ایک نظم میں دل چیرنے والے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

جب تمام شہر میں میرے دل کے چراغ ٹکڑے ٹکڑے کیے جا رہے تھے
جب میرے طفلانہ عشق کی آنکھوں پر
قانون کے سیاہ رومال کی پٹی باندھی جا رہی تھی
جب میری آرزو کی کنپٹیوں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے
جب میری ہستی ہیچ تھی... ہیچ
بجز دیواری گھڑی کی ٹک ٹک کے
میں نے تہیہ کرلیا تھا
کہ مجھے کرنا ہے، کرنا ہے، کرنا ہے
دیوانہ وار پیار

فروغ کے کلام کے بے شمار محاسن ہیں اور اس کی ہر نظم میں ایک انوکھی خوبی اور جدت موجود ہے۔ اس کے لیے شاعری کوئی شغل نہیں تھا بلکہ اس کی روح اور قلب کی حقیقت تھی۔ وہ ایک ذہین اور گہرے مشاہدے کی حامل شاعرہ تھی۔ اسی لیے وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کلام میں فکری ارتقاء کا سفر نظر آتا ہے۔ "اسیر" میں فروغ ایک زمانہ سازی کی دورخی سے ناآشنا معصوم روح کی طرح ہے جو زبان کے ترنم کا نہایت بارور اور تخلیقی استعمال کرتے ہوئے اپنے فطرت سے لگاؤ اور عاشقانہ تجربے کا اظہار کرتی ہے۔ اپنے بےلاگ مشاہدہ سے وہ ایک تضاد کو دریافت کرتی ہے۔

بڑھ کے تاریکی سے جب آیا
پیکر ذرات ظلمت تھا
جب ذرا نزیک تر پہنچا
ورطہ تاریک لذت تھا

اس کے علاوہ

تھیں جڑیں اپنی سیاہی میں
دل مگر تھے نور کے میوے
ایک دوجے کو کیا تھا سیر
دور باغوں کی بہاروں سے
(پتھر کا صبر، اسیر)

"اسیر" کے بعد "دیوار" اور "عصیاں" میں اس کی فطری شوخی، زندگی کے لیے امنگ اور دردو غم سے پیکار کے ساتھ ساتھ فکر کی نشوونما ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اب صرف اشکبار نہیں بلکہ اپنے الم کی جانب تحیر سے نگراں بھی ہے اور ہستی کے بنیادی سوال اٹھا رہی ہے۔

رات گیلے راستے پر میں نے خود سے پوچھا
زندگی کیا ہماری پرچھائیوں سے رنگ لیتی ہے
یا ہم خود اپنی پرچھائیوں کی پرچھائیں ہیں؟
تیرگی درد ہے یا مسرت؟
جسم زنداں ہے کہ ہے صحرائے آزادی؟
(پرچھائیوں کی دنیا، دیوار)

فروغ کے دوسرے دور یعنی "تولدِ دیگر" اور اس کے بعد کا کلام ہستی کی فنا پزیری پر دلدوز تاسف و ملال سے مملو ہے۔ ماورائے مظاہر حقیقت کی جستجو کرتے ہوئے غالباً اس نے ہستی کے اس روپوش پہلو کی جھلک دیکھ لی تھی جسے ہسپانوی فلسفی انومانو نے "وجود کے المیے" کا نام دیا ہے۔ ساتھ ہی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی موضوعات بھی اس کی شاعری میں شامل ہونے لگے تھے۔ "میرا دل باغیچہ کے لیے جلتا ہے اور "کوئی آرہا ہے" اس کی دو حسین و جمیل اور موثر مثالیں ہیں۔

کوئی آرہا ہے
اور دستر خوان بچھارہا ہے
اور روٹی تقسیم کررہا ہے
اور پیپسی تقسیم کررہا ہے
اور کالی کھانسی کا شربت تقسیم کررہا ہے
اور ہمیں بھی ہمارا حصہ دے رہا ہے

یہ سماجی انصاف اور مساوات کے لیے لکھی ہوئی دنیا کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ فروغ ایک جدید ذہن رکھتی تھی اور اپنے گردوپیش کے حالات سے خود کو ہرگز دور نہیں رکھ سکتی تھی۔ سیاسی موضوعات کا اس کی شاعری میں داخل ہونا ناگزیر تھا

جس کی اولین جھنکار اس کی نظم "اے مرزِ پُرگہر" میں سنائی دیتی ہے۔ اس نظم میں فروغ نے نام نہاد "حب الوطنی" کے پرزے کرتے ہوئے اس کے پیچھے کارفرما تملق، خوشامد پرستی اور مال بنانے کی جہد کو بے نقاب کیا ہے اور ساتھ ہی اصل ایران کا نقشہ پیش کیا ہے جہاں شاعرہ کا پہلا قدم آلودہ فضا اور کیچڑ بھری سڑکوں پر پڑتا ہے، جہاں "بلبلان مرموز" "ازراہ تفنن" سینکڑوں بوڑھے کووں کا روپ بھرے منڈلا رہی ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر زندگی مہلت دیتی تو فروغ کی شاعری کا تیسرا دور فلسفیانہ اور سیاسی موضوعات سے عبارت ہوتا۔

ترجمہ

فروغ فرخزاد کی نظموں کا ترجمہ میرے لیے ایک مسرت انگیز تخلیقی تجربہ تھا۔ زیرِ نظر انتخاب نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے فروغ کے کلام کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے کہ بلکہ ترجمے میں یہ خیال بھی رکھا گیا ہے کہ ان اشعار کی نغمگی اور ترنم قاری تک جوں کا توں پہنچ جائے۔ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ بیشتر نظمیں ان ہی بحروں اور ردیف و قافیہ کے ساتھ ترجمہ کی گئی ہیں جو فروغ نے استعمال کی تھیں اور چوں کہ اردو میں فارسی تراکیب کا استعمال ممکن ہے اس لیے انھیں اکثر بغیر تبدیل کیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح ترجمے میں اصل نظموں کی روح اور نغمگی جوں کی توں موجود ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سرتاسر فروغ فرخزاد ہی ہے جو اپنی نظموں کے اصل شعری جوہر کے ساتھ میری طرح دوسرے قارئین کو مسحور و خیرہ کردے گی۔

فہمیدہ ریاض

دو لبوں کے درمیاں
بوسہ شعلہ زن ہوا

اس نظر میں گناہ ہنستا تھا
چہرے پر نُور ماہ ہنستا تھا
ان لبانِ خموش کی رہ میں
شعلۂ بے پناہ ہنستا تھا

شرم اور شدتِ نیاز سے گنگ
ان نگاہوں سے جن میں مستی تھی
میں نے آنکھوں میں جھانک کر یہ کہا:
عشق کا کچھ ثمر ملے گا کبھی؟

شب کی اس رازدار خلوت میں
ایک سائے پہ خم ہوا سایہ
سانس لرزی کسی کے چہرے پر
دو لبوں میں بھڑک اٹھا بوسہ

یادِ گزشتہ

شہر ایک رودِ پُرخروش کے کنار میں
اپنے باغ و راغ و نور بار شب سے پُرخروش
اور اس میں میرا دل
ہے اسیرِ دام ایک مردِ پُرغرور کا

رود کا کنار، جس نے اُس کے اور مرے لیے
اپنے بازوؤں کو کھول کر رکھا تھا سالہا
جس کے ساحلوں پہ، جس کے کُنج کُنج کے تلے
اس نے میرے بوسہ ہائے لب چُرائے بارہا

ماہتاب ہے گواہ
میں نے اُس کے سنگِ دل کو اپنے سحرِ عشق سے
کیسے نرم کر دیا
ماہتاب جانتا ہے، اُس نگہ کی بے رُخی میں
اشکِ شوق کس طرح
جھلملا اٹھا

بے کراں سمندروں میں
ہم نے اک سفینے پر سفر کیا

نیم شب کی خامشی کو توڑ کر
اور ہماری بزم پر
کی نجوم نے نظر

طفل کی طرح مرے کنار میں جو سو گیا
میں نے اپنے لب رکھے تھے اُس کی بند آنکھ پر
غرق ہو گیا جو پیرہن مرا
اُس نے جھک کے دستِ آب سے اسے چھڑا لیا

آہ آج مَیں وہی ہوں اور یہ خلوت و سکوت
شہرِ پُر خروش، تجھ کو یاد کر رہی ہوں میں
جس سے بستہ دل مرا ہے تُو اُسے عزیز رکھ
اُس کی یاد سے دل اپنا شاد کر رہی ہوں میں

پائیز*

موندی ہیں میں نے غم سے بھری آنکھیں
افسوں شعار چہرۂ فطرت پر
دیکھوں نہ جلوہ حسرت و ماتم کا
آئے نظر نہ مجھ کو تری صورت

پائیز، اے مسافرِ خاک آلود
دامن میں چیز کیا ہے نہاں تیرے
کچھ برگِ خشک و مُردہ تری ثروت
سرمایہ اور پاس کہاں تیرے

جز غم دیا ہے کیا دلِ شاعر کو
تیرے غروبِ تیرہ و ساکت نے
جز سردی و ملال نہیں بخشا
اِس جانِ دردمند کو کچھ تُو نے

تیرا سکوت غم کو بڑھاتا ہے
آزار دے رہا ہے غمِ خفتہ
اُلجھے ہوئے خیالوں میں رقصاں ہے
وہ آرزو کہ اب ہوئی گُم گشتہ

---

*پائیز: خزاں

پائیز، اے سرودِ خیال انگیز
پائیز، اے ترانۂ محن پرور
پائیز، اے تبسّمِ افسردہ
افسوں شعار چہرۂ فطرت پر

بغاوت

لبوں پر مت لگا قفلِ خموشی
کہ دل میں قصہ ناگفتہ ہے میرا
مرے پیروں سے یہ بندِگراں کھول
کہ اب غم سے دل آشفتہ ہے میرا

اِدھر آ مرد، اے موجودِ خودخواہ
اِدھر آ، اس قفس کا کھول دے در
گزاری عمر گر زنداں میں مَیں نے
نفَس بھر کے لیے مجھ کو رہا کر

پرندہ ہوں مَیں وہ جو مدّتوں سے
ترستا ہے کرے پرواز اک بار
مرا نغمہ بنا سینے میں نالہ
بہ صد حسرت کروں آغاز اک بار

لبوں پر مت لگا قفلِ خموشی
مجھے کہنا ہے سربستہ ہے جو راز
کہ پہنچے گوشے گوشے تک جہاں کے
مری یہ آتشیں، پُردرد آواز

کروں پرواز مَیں، اب کھول یہ در
بہ سُوے آسمانِ روشنِ شعر
کروں گر ترک مَیں پرواز اپنی
رہے مجھ سے معطر گلشنِ شعر

مرے لب تیرے بوسوں سے ہیں شیریں
مرا تن تیرے دَم سے عطر آگیں
مگر نظروں میں ہیں پنہاں شرارے
کیا ہے تُو نے یہ دل غم سے خونیں

مگر اے مرد، اے موجودِ خودخواہ
نہ کہہ یہ تنگ ہے، یہ شعر ہے ننگ
مری شوریدہ حالی تُو نہ سمجھا
قفس کی یہ فضا ہے تنگ، ہے تنگ

نہ کہہ یہ شعر سر تا پا گنہ تھا
گنہ کو کوئی تو پیمانہ دے دے
بہشت و آبِ کوثر آپ رکھ لے
مجھے یہ قعرِ دوزخ خانہ دے دے

کتاب و خلوت و شعر و خموشی
مری ہستی ہیں، میری زندگانی
میں جنت میں نہ جاؤں، غم نہیں ہے
کہ دل میں ہے بہشتِ جاودانی

ڈھلے جب رات اور رقصاں ہو کہرا
میانِ آسمانِ گنگ و خاموش
پڑے سوتے ہو تم، مَیں مست ہو کر
ہوئی ہوں چاند سے اُس دم ہم آغوش

ہوائیں لیتی ہیں بوسے ہزاروں
ہزاروں بار لب تک دھوپ پہنچی
پہ زنداں میں، دَروغہ تُو ہے جس کا
مری بنیاد اک بوسے سے لرزی

پرے کر یہ حدیثِ نام، اے مرد
ہے بدنامی میں لذّت جاودانہ
خدا بخشے گا مجھ کو، وہ خداوند
دیا شاعر کو جس نے دل دِوانہ

کروں پرواز مَیں، اب کھول یہ در
بہ سُوئے آسمانِ روشنِ شعر
کروں گر ترک مَیں پرواز اپنی
رہے مجھ سے معطّر گلشنِ شعر

چھوٹا ہوا گھر

جانتی ہوں کہ دور اک گھر سے
زندگی کی خوشی جا چکی ہے
رو رہا ہے وہاں کوئی بچّہ
جس کی ماں چھوڑ کر جا چکی ہے

ہر گھڑی ذہن میں دوڑتا ہے
نقشِ بستر کہ ہے خالی و سرد
نقشِ اُس ہاتھ کا جس نے ڈھالا
ایک پیکر وہاں، با غم و درد

دیکھتی ہوں کنارِ بخاری
سایہ اُس کا ہے گُم زور و لرزاں
سایہ اُن بازوؤں کا کہ جن کو
زندگی چھوڑ دینا تھا آساں

دور سوتا ہے غمگین بچّہ
خستہ و پیر دایہ کے بَر میں
دودھ قالین کے پھولوں میں ہے جذب
سرنگوں ایک پیالی پڑی ہے

رہ گئی ہے کھلی ایک کھڑکی
رنگ پھولوں کا اُڑنے لگا ہے
پردہ اُفتادہ شانے پہ در کے
آبِ گلدان سُوکھا پڑا ہے

آنکھیں بلّی کی ہیں سرد و بے نُور
نرم بوجھل قدم رکھ رہی ہے
شمع کا شعلۂ آخریں ہے
گویا اب ہچکیاں لے رہی ہے

جانتی ہوں کہ دور اک گھر سے
زندگی کی خوشی جا چکی ہے
رو رہا ہے وہاں کوئی بچّہ
جس کی ماں چھوڑ کر جا چکی ہے

آہ مَیں خستہ جان و پریشاں
اپنی دُھن میں چلی جا رہی ہوں
یارِ من شعر و دلدارِ من شعر
جا رہی ہوں کہ بس اُس کو پالوں

اے ستارو، اے ستارو

اے ستارو تم فرازِ آسمان سے
یوں نشیب کی طرف نگاہ سے اشارہ گر
اے ستارو ابر کے پرے سے یوں نظارہ گر

ہاں یہ مَیں ہوں مَیں کہ اس سکوتِ شب کے درمیاں
نامے عاشقانہ پارہ پارہ کر رہی ہوں آج
اے ستارو تم اگر کرو ذرا مری مدد
دامن اُس کے غم میں پُرستارہ کر رہی ہوں آج

اُس کے دل میں جب وفا کی بُو ذرا رہی نہ ہو
جورِ بے کرانہ و بہانہ کیوں کروں نہ مَیں
ان مصاحبانِ خود پسند کے کنار میں
ناز و عشوہ ہائے زیرکانہ کیوں کروں نہ مَیں

اے ستارو کیا ہوا، کیوں مری نگاہ میں
وہ نشاط و نغمہ و ترانہ ختم ہو گیا؟
اے ستارو کیا ہوا، اُن لبوں پہ کس طرح
اُس کا راگ، گرم و عاشقانہ ختم ہو گیا؟

بسترِ آب مرا تھی ہے، جامِ بادہ سرنگوں
سر رکھا ہوا ہے اُس کے عشقیہ خطوط پر
سر رکھا ہوا ہے درمیان ان سطور کے
جستجو کروں کہ کچھ نشان بھی وفا کا ہے

اے ستارو تم تو جانتے ہو، تم ہو آشنا
کتنے دورُخے ہیں، پُر جفا ہیں ساکنانِ خاک
جا چھپے ہو کیا اِسی لیے تم آسمان میں
اے ستارو، اے ستارو، اے ستارو خوب و پاک

مَیں کہ میری ٹھوکروں میں سارا ہست و بود تھا
تا کہ اُس کے ہونٹ اپنے عشق پر روا کروں
مجھ پہ لعنتِ خدا ہو اس کے بعد اگر کبھی
عاشقانِ باوفا سے کچھ بجز جفا کروں

اے ستارو تم بھی گویا قطرے آنسوؤں کے ہو
دامنِ سیاہِ شب پہ اپنا سر دھرے ہوے
اے ستارو اُس جہانِ جاودان و پاک سے
اک دریچہ اِس جہاں کی سمت کھولتے ہوے

وہ چلا گیا، پہ عشق دل سے جا نہیں رہا
اے ستارو کیوں نہ اُس نے پھر سے میری چاہ کی؟

اے ستارو، اے ستارو، اے ستارو دو خبر
کچھ دیارِ عاشقانِ جاوداں کی راہ کی

حلقہ

ایک لڑکی نے یہ پوچھا ہنس کر:
"رازِ اس حلقۂ زرّیں کا ہے کیا
جس نے انگلی کو مری
اس قدر سخت دبا رکھا ہے
جس کی پیشانی پر
اس قدر تابش و رخشندگی ہے؟"

مرد حیران ہوا اور بولا:
"حلقۂ خوش بختی،
حلقۂ زندگی ہے"

وقت گزرا
اور اک دن زنِ افسردہ نے
حلقۂ زر پہ نظر پھر ڈالی
اور دیکھے وہ شب و روز جو بے سود گئے
صَرفِ امّیدِ وفائے شوہر

روئی عورت کہ دریغ!
حلقۂ زر میں ہنوز
وہی تابش، وہی رخشندگی ہے
یہ غلامی کا ہے حلقہ، سمجھی
حلقۂ بردگی و بندگی ہے

گنہ کیا میں نے

گنہ کیا میں نے
گنا ہِ پُر لذت
اک اس کنار میں جو گرم و آتشیں تھی بہت
اور ایسے بازوؤں میں
سلگ رہے تھے جو، ظالم تھے، آہنیں تھے بہت

اندھیری خلوت میں
اندھیری اور خموش...
نظر ملی اس سے
نگاہ راز سے پُر
عجب نیاز سے پُر
اور ایسی خواہش سے
کہ بے قراری سے سینے میں دل مرا لرزا

میں اس کے پہلو میں بیٹھی رہی پریشاں سی
لبوں نے اُس کے لبوں پر مرے
ہوس چھڑکی
تو کیا ہوا مجھ کو
کہ میرے دل سے پریشانیِ زمانہ گئی

نہایت آہستہ
میں اس کے کان میں کہنے لگی فسانۂ عشق
تری تمنا ہے جاناں، تری تمنا ہے
تری تمنا ہے، آغوشِ جاں فزا تیری
تری تمنا ہے...
اے مرے دِوانۂ عشق

ہوَس سے اُس کی نظر میں بھڑک اٹھے شعلے
شرابِ سُرخ پیالوں میں رقص کرنے لگی
تھا نرم اک بستر
اور اُس کے سینے پر
انوکھی مستی سے میرا بدن لرزتا رہا

گنہ کیا میں نے
گناہِ پُرلذت
کنارِ پیکرِ لرزاں...
پیکرِ مدہوش
مرے خدا! مجھے کیا علم کیا کیا میں نے
اندھیری خلوت میں
اندھیری اور خموش

پتھر کا صبر

روزِ اول یہ کہا خود سے
بس دوبارہ اب نہ ہوگی دید
روز دوم پھر یہ دوہرایا
لیک با اندوہ و با تردید

روزِ سویم بھی گیا پھر بھی
برسرِ پیمان میں خود تھی
گھٹ رہی تھی سانس زنداں میں
اور زنداں بان میں خود تھی

مجھ میں اک دیوانۂ باغی
کررہی تھی گریہ زاروں زار
ڈھونڈتی تھی مل سکے روزن
سر ٹپکتی تھی سرِ دیوار

نیم شب سوتے میں سنتی تھی
اس کا گریہ، آہ وہ رونا!
تھا مری آواز میں شامل
دردِ سیال اس کی آہوں کا

سرزنش کی شرمساری سے
کس لیے بیہودہ روتی ہے؟
روتے روتے چیخ اُٹھی وہ
عشق ہے، تو کیا اسے جانے!

کیا صدا تھی وہ صدا لرزاں!
اس جہاں سے دور لے جائے
اور دل میں ایسے ہیجاں تھی
قبر سے مردہ اٹھا لائے

آہ مردہ، جس کے پیکر میں
عطرِ شور انگیزِ شب بو تھا
دل مرے سینے میں یوں لرزا
جیسے قلب بچہ آہو تھا

بڑھ کے تاریکی سے جب آیا
پیکر ذرات ظلمت تھا
جب ذرا نزدیک تر پہنچا
ورطۂ تاریکِ لذت تھا

میں تھکی بیٹھی تھی بستر میں
خیرہ چشم اپنے تصور سے
کشتئ تخیل ہولے سے
جارہی تھی مرزِ دنیا سے

ایک تصویرِ غبار آلود
آہ! بس اک مختصر شب کی
اور وہ کمرہ، ساکت و سرشار
پھر گیا نظروں میں پھر میری

میرے ہاتھوں نے اندھیرے میں
لمس۔ ان ہاتھوں کا پہچانا
درد تھا اس کی نگاہوں میں
وہ مری مانند غمگین تھا

تھیں جڑیں اپنی سیاہی میں
دل مگر تھے نور کے میوے
ایک دوجے کو کیا تھا سیر
دور باغوں کی بہاروں سے

کب سے غلطاں ہوں خیالوں میں
کون ہوں میں کہہ نہیں سکتی
آہ کیا معزور ہوں بےحد
یا ازل سے ہوں کوئی باندی

توڑ دوں پیماں اگر اپنا
پھر وہی غم مار ڈالے گا
پھر وہی امید ہے شاید
آخرش اک دن وہ آئے گا

نغمۂ درد

میرے ساتھی، اور مجھ سے یوں جدا
میرے ساتھی، اور نظر ہے سوئے غیر
میرے ساتھی گفتگو کی رہ نہیں
ہو گیا ہے گرمِ گفتگوئے غیر

غرقِ غم ہے میری جانِ سوختہ
با تو بےقرار و بےتو بےقرار
آہ وہ گھڑی کہ مجھ سے بےخبر
ناگہاں تو چھوڑ دے مرا دیار

تیرا سایہ ہوں مَیں تُو جہاں بھی جائے
سر دھرا ہوا ہے تیرے پاؤں میں
کی نہیں ہے جستجوئے غیر ابھی
جس کو اس مقام پر بٹھاؤں مَیں

میرا غم، مری خوشی عجیب ہے
تجھ سے چاہتی ہوں، دے مجھے پناہ
بن گئی ہوں موجِ وحشت و اَلم
ہو گئی اسیرِ جذبہ ہائے ماہ

"چھوڑتا ہوں میں تجھے"، یہ کیا کہا!
چھوٹتا ہے رشتۂ وفا کہیں؟
ٹوٹتا ہے عہدِ عاشقاں بھی کیا؟
خود سے توڑ دوں، یہ تجھ سے تو نہیں!

رات خوابِ خوش میں تجھ کو دیکھ کر
شاد تھی، پہ خواب کا میں کیا کروں
غنچہ تو نہیں کہ مستِ اشتیاق
اُٹھ کے تجھ کو شاخِ گل سے توڑ لوں

وہ تری نظر کی آتشِ کبود
جل رہی ہے تیرہ شب کے سائے میں
بند کر نہ راہ، بلکہ شوق سے
لے چل اپنے درد کی سرائے میں

گمشدہ

بعد اُس دیوانگی کے
کر نہیں سکتی ہوں باور
اب میں عاقل ہو گئی ہوں
اس طرح "وہ" مر گیا ہے میرے اندر
خستہ و خاموش و باطل ہو گئی ہوں

پوچھتی ہوں آئنے سے ہر گھڑی
کون ہے؟ تیری نظر میں کون ہے یہ دوسری؟
آئنہ کہتا ہے لیکن
جو میں تھی اب اُس کا سایہ بھی نہیں
مثل اُس رقاصہ بندی کے سَو سَو ناز سے
رقص کرتی ہوں، یہ اپنی قبر پر
آہ، باصد حسرت اس ویرانے میں
روشنی کرتی ہوں اپنی ذات سے

شہر کی جانب نہیں جاتی کبھی
گور میں سوتی ہوں اپنی بے گماں
دل میں ہے گوہر، مگر اک خوف سے
کر دیا ہے اُس کو دلدل میں نہاں

جا رہی ہوں، خود سے پوچھا تک نہیں
رہ کہاں؟ منزل کہاں؟ مقصود کون؟
بوسے دیتی ہوں مگر غافل ہوں خود
اس دلِ دیوانہ کا معبود کون؟

مر گیا وہ، میرے اندر، اور پھر
جو کچھ کہ تھا
میری نظروں میں بدل کر رہ گیا
رات کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں نے میری روح کو
قید گویا کر لیا
ہاں... یہ مَیں ہوں... مَیں... مگر کیا فائدہ
وہ جو مجھ میں تھا نہیں باقی رہا
پوچھتی ہوں زیرِ لب دیوانہ وار
"وہ"، کہ مجھ میں تھا
وہ آخر کون تھا؟

اندوہ پرست

کاش مَیں پائیز ہوتی، کاش مَیں پائیز ہوتی
کاش مَیں پائیز سی خاموش و غم آمیز ہوتی
آرزو کے برگ میرے
ہو گئے ہیں زرد
اور مری آنکھوں کے سورج، سرد

آسمانِ سینہ ہے پُردرد
ناگہاں اندوہ کے طوفاں نے جاں میں چنگ چھیڑا
آنسوؤں نے مثلِ باراں
رنگ پھیرا
آہ، گر پائیز ہوتی
وحشی و پُرشور و رنگ آمیز ہوتی
پڑھ رہی ہے شاعری آنکھوں میں شعرِ آسمانی
میرے پہلو میں دلِ عاشق کے شعلے
اور شرارِ آتشِ دردِ نہانی

میرا نغمہ:
جیسے آوازِ نسیمِ پَر شکستہ
عطرِ غم جیسے چھڑکتا ہو دلوں پر جو ہیں خستہ

سامنے ہے:

چہرۂ تلخِ زمستانِ جوانی

عقب میں:

آشوبِ تابستانِ عشقِ ناگہانی

سینہ ہے:

منزل گہِ اندوہ و درد و بدگمانی

کاش مَیں پائیز ہوتی...

کاش مَیں پائیز ہوتی...

اندوہِ تنہائی

برف باری ہو رہی ہے
برف باری ہو رہی ہے
پار شیشے کے —
اس خموشی میں، مرے دل میں
بو رہا ہے ہاتھ کوئی
درد کے دانے

مو سپید آخر ہوئی اے برف!
تاکہ میرا دیکھ لے انجام
گر رہی ہے کیوں فقط دل پر
قبر پر میری نہیں کیوں کر رہی آرام

روح لرزاں ہے مری مثلِ نہال
آہ یہ سرمائے تنہائی
دل کی تاریکی سے اُبھری آ رہی ہے
وحشتِ دنیائے تنہائی

تُو بھی اب گرمی نہیں دیتا
عشق، اے خورشیدِ یخ بستہ!

سینہ ہے صحرائے نومیدی
خستہ ہوں مَیں
عشق سے بھی ہو چکی خستہ

خشک تیرا بھی ہوا غنچہ
شعر، اے شیطانِ افسوں کار
آخرش اس خوابِ درد آلود سے
جان من، بیدار ہو بیدار

بعد اُس کے جس طرف دیکھا
صرف پایا ایک افسونِ سراب
کیوں کیا اُس کا تعاقب آہ
وہ کہ نکلا نقشِ خواب

اے خدا اب بخش دے مجھ کو
لمحہ بھر آسائشِ دوزخ
تا بہ کے دل میں چھپا رکھوں
حسرتِ گرمائشِ دوزخ

بعد اُس کے اَور کیا ڈھونڈوں
بعد اُس کے اَور کیا پاؤں
تا بہ کے برساؤں اشکِ سرد
تا بہ کے بس قبر کو چاہوں

برف باری ہو رہی ہے
برف باری ہو رہی ہے
پار شیشے کے ___
اس خموشی میں، مرے دل میں
ہو رہا ہے باتھ کوئی
درد کے دانے

جواب

ہم پر خدا نے کی ہے تبسّم بھری نگاہ
ہرچند ہم نے اُس کی نہ کی اختیار راہ
لیکن فریب و مکر سے مانندِ زاہداں
چھپ کر خدا کی آنکھ سے کرتے نہیں گناہ

پیشانی اپنی داغِ گنہ سے سیہ سہی
لیکن نمازِ مکر کے داغوں سے بے ربا
نامِ خدا کبھی بھی نہ لیں، بہتر اس سے ہے
بہرِ فریبِ خلق رٹیں گر "خدا خدا"

کیا غم ہمیں کہ شیخ نے کل شب بصد خوشی
ہم پر درِ بہشت اگر بند کر دیا
وہ کھول دے گا، وہ، کہ بصد لطف اور صفا
غم جس نے اپنی خاک کی طینت میں بھر دیا

طوفانِ طعنہ اپنے تبسّم سے تھم گیا
ہم کوہ ہیں، میانۂ دریا نشستہ ہیں
دل میں چھپائے گوہرِ یکتائے راستی
ہم موجِ حادثات میں تنہا نشستہ ہیں

وہ آگ جس کے شعلے ہمارے دلوں میں ہیں
چنگاری اس کی شیخ کے دامن پہ گر گرے
ہم کو، کہ سوختہ ہیں شرارانِ عشق کے،
نامِ گناہ کارہ و رُسوا کبھی نہ دے

جانے دو گر ہمارے لیے طعنہ زن ہے خلق
سنتے رہو فسانۂ عشقِ مدامِ ما
"ہر گز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد زعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما"

سایوں کی دنیا

رات، گیلے راستے پر
ہمارے سائے گویا ہم سے گریزاں تھے
ہم سے دور، نشیب راہ میں
چاندنی کے لرزاں، ملول غبار میں

انگور کی شاخ کی بلندی پر، سرد اور بوجھل
نرمی سے ایک دوسرے کو
آگے کی طرف ڈھکیلتے ہوئے
رات، گیلے راستے پر
عطر آگیں خاک کے سکوت میں
اور گاہے، بے صبری سے
ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہوئے
ہمارے سائے...
شبنم دوشیں سے مست پھولوں کی مانند
جیسے ہماری تلخیوں سے گریزاں تھے
وہ نغمے جو ہم ہرگز نہیں گاتے
وہ نغمے جو ہم نے غصّے سے
اپنے سینے کے سکوت میں ڈھکیل دیے ہیں
زیرِ لب اشتیاق سے گا رہے تھے

لیکن ان سایوں سے دور
ان کی دل بستگی کی داستان سے بے خبر
ان کی جدائی اور پیوستگی سے
ہمارے تھکے ہوئے جسم
زندگی کو شکل دے رہے تھے
رات، گیلے راستے پر،
میں نے خود سے پوچھا تھا
زندگی کیا ہماری پرچھائیوں میں رنگ بھرتی ہے؟
یا ہم خود اپنی پرچھائیوں کی پرچھائیاں ہیں؟

اے ہزاروں سر گرداں روحو،
تاریکی کی موجوں میں میرے گرد لرزاں
میرا سایہ کہاں ہے؟
"میری خاموش صدا کے بلور میں نورِ وحشت
درخشاں ہے"
میرا سایہ کہاں ہے؟
میرا سایہ کہاں ہے؟

میں نہیں چاہتی
اپنے سائے کو لحظہ بھر بھی خود سے جدا کروں
میں نہیں چاہتی
وہ مجھ سے دور رہگزر پر لڑکھڑائے
یا بوجھل اور خستہ جا گرے

راہ رووں کے قدموں کے نیچے
اپنی جستجو کی راہ میں وہ
دروازوں کے بند لبوں کے سامنے
کیوں آئے؟
وہ کیوں اپنا تن گھِسے
ہر گھر کے در و دیوار سے
کیوں مایوسی سے
سرد بیگانہ زینوں پر قدم رکھے

آہ، اے خورشید!
میرے سائے کو مجھ سے دور کیوں کرتا ہے؟
میں تجھ سے پوچھتی ہوں
تیرگی درد ہے یا مسرّت؟
جسم زنداں ہے کہ ہے صحرائے آزادی؟
ظلمتِ شب کیا ہے؟
شب
کس کی روحِ سیاہ کا سایہ ہے؟

وہ کیا کہتا ہے؟
وہ کیا کہتا ہے؟
خستہ و سرگشتہ و حیراں
جا رہی ہوں، زیرِ پا ہے
راہِ پُرسش ہائے بے پایاں

یہ شعر تری خاطر

(اپنے بیٹے کامی سے)

یہ شعر کہہ رہی ہوں تری خاطر
گرما کی شام میں کہ جو ہے تشنہ
کرتی ہوں نصف رہ سے سفر آغاز
یہ کہنہ گور، یہ غمِ بے پایاں

گہوارے پر یہ آخری لوری ہے
جو خواب گاہ ہے ترے بچپن کی
شاید ترے شباب کے آنگن پر
بل کھائے ایک دن یہ صدا وحشی

غم کیا کہ میرا سایۂ سرگرداں
سائے سے ترے دور و جدا ہو گا
اک روز آئے گا کہ ہمارے بیچ
کچھ دوسرا نہ غیرِ خدا ہو گا

تاریک در پہ سر دھرے بیٹھی ہوں
اور کھنچ رہی ہے درد سے پیشانی
ملتی ہوں سرد ہاتھوں سے سنگِ در
امید سے، یہ وائے یہ نادانی!

وہ داغِ ننگ خوردہ کہ خنداں تھی
طعنوں پہ اس جہان کے، وہ مَیں تھی
چاہا تھا اک پکار میں ڈھل جانا
لیکن دریغ و درد، کہ "عورت" تھی

لرزے گی جب تری نگہِ معصوم
میری کتاب پر کہ ہے بے آغاز
دیکھے گا ریشہ ریشہ بغاوت ہے
ہر نغمہ و ترانہ و ہر آواز

آنسو بہا رہے ہیں فرشتے یاں
خاموش ہیں تمام یہاں تارے
اِس جا شگوفہ ہائے گلِ مریم
بےقدر تر ہیں خارِ بیاباں سے

ہر راستے پہ بیٹھے ہوئے ہیں یاں
عفریتِ ننگ و کِذب و ریاکاری
تاریک آسماں میں نہیں کوئی
اُمیدِ صبحِ روشن و بیداری

ٹھہرو ذرا، دوبارہ سے ہوں لبریز
آنکھوں کے پیالے دانۂ شبنم سے
میں اس لیے ہوئی تھی زخود رفتہ
پردے ہٹاؤں چہرۂ مریم سے

ہے دور مجھ سے ساحلِ خوش نامی
سینے میں بس ستارۂ طوفاں ہے
افسوس میرے غیظ کے شعلے کی
پرواز گاہ صرف یہ زنداں ہے

تاریک در پہ سر دھرے بیٹھی ہوں
اور کھنچ رہی ہے درد سے پیشانی
ملتی ہوں سرد ہاتھوں سے سنگِ در
امّید ہے، پہ وائے یہ نادانی

ان مکر اور فریب کے پُتلوں سے
میں جانتی ہوں، جنگ کب آساں ہے
شہرِ من و تُو، اے مرے دل کے نور،
مدّت سے آشیانۂ شیطاں ہے

حسرت بھری نظر سے تری گزرے
اک روز داستان مرے غم کی
تو مجھ کو ڈھونڈ لے مرے شعروں میں
خود سے کہے کہ ہاں، مری ماں وہ تھی

پوچ

آہ محبوب آنکھیں تمہاری
سو رہی تھیں
سرد و خاموش
کہہ نہ پائے تھے تم جو زباں سے
وہ نگہ سے
کہہ چکی تھیں

مجھ کو اور مجھ میں جو کچھ نہاں ہے
آج تم چھوڑنا چاہتے ہو
یاد آیا مجھے، رہ گزر پر
بے شکیبی سے اک روز مجھ کو
کھینچتے تھے
اپنے پیچھے

آخری بار
آخری بار
آخری لحظۂ تلخِ دیدار
سربسر پوچ آئے نظر میں
کار سارے
اس جہاں کے

رو رہی تھی ہَوا
اور کھڑی تیں
سُن رہی تھی
اُن کی آواز
گر رہے تھے جو پتّے خزاں کے

آہ تم نے مجھے
پھر بلایا
اور پھر مجھ سے دامن چھڑایا
تختِ جاجم پہ پھر سے بٹھایا
اور پھر کر دیا
بُردِ دریا
گو کہ ریشم میں اس غم کے ملفوف
سالہا میرے دل میں رہے تم
آہ ہرگز نہ سمجھا مرا عشق
کیا تھے تم، کیا تھے تم،
کون تھے تم؟

دیر

روزِ خستہ کی آنکھ میں اُبھرا
گنگ و تیرہ
نیند کا خواب
اب دوبارہ تجھے جانا ہوگا
پھر اسی راہ سے تیز قدموں
اپنے گھر کو

تا کہ یہ تیرا تاریک سایہ
تیری آغوش میں پھر سمائے
منتظر ہے وہاں کوئی تیرا
یہ گماں دل میں ہرگز نہ آئے

قبر کی مثل وہ گھر کھڑا ہے
دُھول سے جو اَٹ چکا ہے
نُقرئی تار سے بارشوں کے
تاج کل جس کے سر پر دھرا تھا

تو نے دروازہ جیسے ہی کھولا
تیری جانب

ساکت و تیرہ گوشوں سے اُڑتے
آئے صد ہا سلامِ خموشی
کتنے ماندے
کتنے خستہ

آہ ظلمت کا دل جل رہا ہے
تیرے چھوٹے سے کمرے میں کیسے!
نرم و رنگین پردوں پہ اتری
رات، اک سانپ لہرائے جیسے

ایک گھڑیال دیوار پر ہے
اس میں نے ضرب ہے اور نہ آواز
اس سکوت و خموشی کی مجرم
اس فضا سے
خود بخود ہو گئی ٹکڑے ٹکڑے

چوکھٹوں میں یہ کہنہ تصاویر
مضحکہ خیز و فانی یہ چہرے
گزرے وقتوں سے بے رنگ سارے
عارضی تھے
عارضی تھے

آئنہ آنکھ ہے اک بڑی سی
ہے تری سمت گرمِ تماشا
اس کی نظروں کے شیشے پہ ہے کیا
رات کی روحِ سرکش نشستہ؟

ایک بوڑھے پرندے کی مانند
تُو نہیں جا رہی سُوئے بستر
بند آنکھیں، لرزتی ہیں پلکیں
دھر دیا سر
کاغذوں پر

تیرے پہلو میں گویا ہیں گریاں
مُردگانِ گزشتہ کی روحیں
وہ جو اس تخت پر سو چکی ہیں
تجھ سے پہلے

ان گنت جنبشیں ان میں خاموش
آہِ بے تاب
آہِ نالاں
جیسے دلدل کے تاریک رُخ پر
ہوں ہزاروں حبابِ گریزاں

بھر گیا ہے درخت کہن سال
اتنی کووں کی ہے کائیں کائیں
رقص کرتی ہے کھڑکی پہ بارش
ہے معطر
ابرِ ریشم

تجھ کو احساس یہ ہو رہا ہے
اے دریغا،
ہے عبث ہے عبث اپنے غم سے
جنگ کرنا
دیکھ یہ ہے ترا غنچۂ غم
اور اب لکھ
شعرِ تازہ

جنون

دلِ گُم راہ کیا کرے گا مرا
اُس بہاراں سے جو کہ راہ میں ہے
اُس شگوفے سے، لے رہا ہے جو رنگ
اور ابھی شاخۂ سیاہ میں ہے

دلِ گُم راہ کیا کرے گا مرا
ان ہواؤں سے جن میں ہیں رقصاں
بُوئے عشقِ کبوترِ وحشی
نفَسِ عطرہائے سرگرداں

میرے لب پر ترانہ جلتا ہے
اور دل عاشقانہ جلتا ہے
جِلد میں پڑ گئے نمو سے شگاف
سارا تن والہانہ جلتا ہے

میں مچلتی ہوں موج کی مانند
جا رہی ہوں کہیں، یہاں سے دور
کہیں شاخوں میں گر چھپا خورشید
سرِ رہ آ گئی کہ پی لوں نُور

ہوں شگوفے کی شرم سے لبریز
ہے کہیں یارِ من، بہارِ سپید؟
بوسہ گر اِس بہار میں بھی نہ دے
وہ نہیں یارِ من، بہارِ سپید!

دشتِ بےتاب، شبنم آلودہ
میرا محبوب کس کو مانتا ہے؟
سبزہ کچھ کہہ رہا ہے، میں سن لوں
جو مرا یار ہے وہ جانتا ہے!

آسماں اپنے آپ میں نہ رہا
اب جہاں میں سما نہیں سکتا
آہ، گویا کہ اتنا سارا نِیل
آسماں میں سما نہیں سکتا

اے بہار، اے بہارِ افسوں گر
میں سراپا خیال ہوں اُس کا
شعر و فریاد و آرزو ہوں مَیں
اور یہ تیرے جنوں میں حال ہوا

سبزۂ سرد و تازہ و نم پر
میرا تن کس طرح ہے بل کھاتا!
آہ، ایسا خروش، اتنا جوش
دلِ گُم راہ کیا کرے گا مرا

زندگی

زندگی، زندگی یہ مَیں ہوں ہنوز
سر بہ سر تجھ سے آج تک لبریز
نہ یہ سوچا کہ رشتے پارہ کروں
نہ یہ چاہا کروں میں تجھ سے گریز

سارے ذرّات جسمِ خاکی کے
اے مرے شعرِ گرم، تجھ سے ڈھلے
جس طرح بادلوں سے پاک فلک
بادۂ روز سے لبالب ہے

ان گنت کونپلوں سے چھیڑتا ہے
بوتۂ نسترن سرود ترا
باغ میں جب ہوائیں چلتی ہیں
اس کو پہنچاتی ہیں درود ترا

میں نے تجھ کو تجھی میں ڈھونڈا ہے
کسی خواب و خیال میں تو نہیں
میں ڈھلی تیرے سخت ہاتھوں سے
دیکھ لے میری شانِ زیبائی

مجھ میں ہیں ان گنت ترانے سیاہ
مجھ میں ہیں ان گنت ترانے سپید
ہیں ہزاروں شرارہ ہائے نیاز
اور ہزاروں ستارگانِ امید

حیف اُس روز پر کہ غصّے میں
تجھ پہ ڈالی تھی دشمنی کی نظر
جب کہ جانا ترا فریب فضول
تھک گئی، تجھ سے کر رہی تھی حذر

غافل اس سے کہ تُو تو قائم ہے
میں گزرتی ہوں مثلِ آبِ رواں
میں غبارِ زوال میں ڈھلتی
رہِ تاریکِ مرگ پر ہوں دواں

آہ اے زندگی، میں آئنہ ہوں
میری آنکھوں میں ہے تجھی سے نگا
ورنہ گر مرگ مجھ پہ ڈالے نظ
کیوں نہ فوراً یہ آئنہ ہو سیـ

عشق ہے صبح کے ستارے سے
اُڑتے بادل سے عشق ہے مجھ کو
مجھ کو بارش سے عشق ہے، اور ہر
ایسی شے سے جو تیرے نام پہ ہو

سپیدۂ عشق

آسماں، جیسے میرا صفحۂ دل
جلوۂ ماہ سے درخشاں ہے
آج شب نیند سے گریزاں ہوں
نیند سے تیرا خواب اچھا ہے

وحشی بیدوں کے سائے میں خیرہ
اٹھ رہی ہوں سکوت بستر سے
گنگناتی ہوں اک سہانا گیت
اور سر رکھ دیا ہے کاغذ پہ

میری آواز کی صراحی میں
آج صدہا ترانے رقصاں ہیں
میری رگ رگ میں کن انوکھی سی
لذتوں کے خزانے رقصاں ہیں

آہ! گویا کہ کوچۂ دل میں
روحِ شب گردِ کہر گزری ہے
یا نسیم بہار اس رہ پر
نرم رو عطر بیز گزری ہے

میرے ہونٹوں پہ تیرے بوسوں کے
شعلے لالہ کی مثل جلتے ہیں
آہ کتنے ستارۂ پرنور
بالۂ راز میں مچلتے ہیں

میرے سینے میں آج ایک ستار
کوئی انجان شے بجاتی ہے
شعر ہوتا ہے اس طرح موزوں
ساتھ میں بوئے عود آتی ہے

کر نہ سکتی تھی میں کبھی باور
یہ ملاقات بھی کہیں ہوگی
اور تیری وہ چشمِ شور افگن
مجھ پہ یوں گرم و دلنشیں ہوگی

بےگماں خواب کے جہان سے آج
مجھ پہ وا ہو گیا ہے دیدۂ عشق
کیوں نہ پھر میں لکھوں یہ کاغذ پر
"جاوداں باشی اے سپیدۂ عشق"

وہ دن

وہ دن گزر گئے
وہ دن کہ تھے بھلے
وہ سالم و سرشار دن
وہ سلما ستارے کے آسمان
وہ چیری سے پُر شاخسار
بیلوں سے گھِرے
ایک دوسرے کے سہارے کھڑے وہ گھر
کھلنڈرے غباروں کی وہ چھتیں
کیکر کی مہک سے مبہوت گلیاں
وہ دن گزر گئے

وہ دن جب میری پلکوں کی درزوں سے
ہماری آواز، ہوا سے لبریز حباب کی مانند
جوش کھاتی تھی
جس شے پر نگاہ پڑتی تھی
اسے تازہ دودھ کی طرح پی جاتی تھی
گویا میری پُتلیوں میں
ایک بے قرار خرگوش تھا
ہر صبح، بوڑھے سورج کے ساتھ

ان جانے صحراؤں میں جستجو کرتا
راتوں کو تاریک جنگلوں میں اتر جاتا

وہ دن گزر گئے
خاموش برف کے دن
گرم کمرے میں، شیشے کے پیچھے سے
ہر دَم باہر دیکھ کر خیرہ ہونا
میری پاکیزہ برف، مخمل کی طرح نرم
آہستہ آہستہ گرتی تھی
پُرانے چوبی روشن دان پر
الگنی کی کمزور رسی پر
بوڑھے چیڑ کے درخت کے گیسوؤں پر
اور مستقبل کا سوچتی تھی، آہ
مستقبل...
سفید لیس دار مادّہ
نانی کی چادر کے نیچے شروع ہوتا
اور دروازے کی چوکھٹ میں، اس کا مبہم سایہ
نظر آتے ہی
ایک سرد نور کے احساس کے ساتھ
ناگہاں اپنی انتہا کو پہنچ کر ختم ہو جاتا

اور سر گرداں کبوتروں کی پرواز کے خطوط
شیشے کے رنگین جاموں میں
مستقبل...

کرسی کی گرمی خواب آور ہوتی تھی
میں تند و بے پروا
ماں کی نظروں سے دور، غلط خطوط کو
اپنی پرانی کاپی سے مٹاتی رہتی
جب کہ برف خوابیدہ ہوتی
میں باغیچے میں افسردہ گھومتی پھرتی
یاسمن کے خشک گملے کے پاس
مُردہ چڑیوں کو
دفن کیا کرتی

وہ دن گزر گئے
وہ جذبہ و حیرت کے دن
وہ خواب و بیداری کے دن
وہ دن جب ہر سائے میں ایک راز تھا
اور ہر سر بستہ صندوق میں ایک خزانہ
ظہر کے سکوت میں، صندوق خانے کا ہر گوشہ
گویا ایک جہان ہوتا تھا
تاریکی سے کوئی نہ ڈرتا تھا
ہماری آنکھوں میں کارناموں کی شجاعت ہوتی تھی

وہ دن گزر گئے
وہ عیدوں کے دن
وہ سورج اور پھول کا انتظار
وہ عطر کی لرزشیں
خاموش اور محجوب جنگلی نرگسوں کے درمیان
جو شہر کا، زمستاں کی آخری صبح،
دیدار کرتی تھیں
سبز ٹکڑوں میں بٹی طویل سڑکوں پر
خوانچے والوں کی آوازیں
بازار اپنی سر گرداں خوشبوؤں میں تیرتا ہوا
قہوے اور مچھلی کی تُند بُو میں
بازار قدموں کے نیچے پھیل جاتا تھا، کھنچ جاتا تھا، ربڑ کی طرح
اپنے ہر لمحے میں کُھل جاتا تھا
بازار گڑیوں کی آنکھوں میں چکراتا ہوا...
بازار ماں تھا جو تیزی سے ایک سیال رنگ کی جانب جاتی
اور واپس آتی تھی
تحفوں سے بھری ٹوکریاں لیے
بازار بارش تھا جو برستی رہتی، برستی رہتی، برستی رہتی

وہ دن گزر گئے
جسم کے رازوں سے خیرگی کے دن
محتاط آشنائی کے، نیلی رگوں کے حُسن سے

ایک ہاتھ، ایک پھول لیے
دیوار کے پیچھے سے آواز دیتا
ایک دوسرے ہاتھ کو
اور اس مضطرب، خوف زدہ ہاتھ پر
روشنائی کے چھوٹے چھوٹے دھبّے

اور عشق،
جو اپنے شرمیلے سلام سے سب بھید کھول دیتا تھا
گرم، دھوپ دار ظہر کے پہروں میں
ہم نے گلیوں کی دُھول میں عشق پڑھا تھا
ہم قاصد پھولوں کی سادہ زبان سے آشنا تھے
ہم اپنے دلوں کو معصومانہ مہربانیوں کے
باغ میں لے جاتے تھے
اور درختوں کو قرض دیتے تھے
اور گیند، بوسوں کے پیغام لیے، ہمارے ہاتھوں میں
آتی جاتی
اور عشق وہ مضطرب احساس تھا کہ تاریک راہداری میں
ناگاہ
ہمیں محصور کر لیتا
اور جذب کر لیتا، جلتی سانسوں کے انبار میں،
تپش میں، دزدانہ مسکراہٹوں میں

وہ دن گزر گئے
اُن پودوں کی طرح جو دھوپ میں مُرجھا جاتے ہیں
سورج کی تابِش سے مُرجھا گئے
کیکر کے عطر سے مبہوت گلیاں گُم ہو گئیں
کبھی نہ لوٹنے والی سڑکوں کے پُرشور ازدحام میں
اور وہ لڑکی
جو اپنے رخساروں کو
ارغوانی پھولوں کی پنکھڑیوں سے رنگتی تھی، آہ،
اب اک زنِ تنہا ہے
اب اک زنِ تنہا ہے

گزراں

کب تلک چلے کوئی
کب تلک کرے تلاش
اک دیار دوسرا
پھر دیار دوسرا

میں نہ ڈھونڈ پاؤں گی
بار بار، ہر دفعہ
کوئی عشق دوسرا
کوئی یار دوسرا

کاش ہوتے ہم پرند
اور اپنی منزلیں
ساری عمر، ساری عمر
ایک مرغزار سے
مرغزار دوسرا

جانے کب سے تیرگی
برس رہی ہے ابر سے
گھُل رہی ہے ہر خیال و خواب میں

میرے لب پہ تیرے بوسے
اس طرح ہیں، اس طرح
ڈھیرے ڈھیرے جیسے عِطر ہو فنا

عشق غم زدہ مرا
کانپتا ہے خوف سے زوال کے کچھ اِس طرح
کانپتی ہے میری ساری زندگی
دیکھتی ہوں جب تجھے
دیکھتی ہوں گویا اک دریچے سے
اک درخت پُر بہار
جو خزاں کی زد میں ہے
روے آب پر رواں کوئی نقش جس طرح
روز و شب
روز و شب
روز و شب

ٹھہر، بھول جاؤں مَیں
کیا ہے تُو
صرف ایک لمحہ، جو مری نظر
بسطِ آگہی کی سَمت کھول دے؟
ٹھہر، بھول جاؤں مَیں

رُوئے خاک

آرزو نہ میں نے کی
اک ستارہ بن سکوں سرابِ آسمان میں
برگزیدگاں کی روح کی طرح
ہم نشیں بنوں فرشتگان کی
ہرگز اِس زمین سے جدا نہیں ہوئی کبھی
میں ستاروں کی تو آشنا نہیں ہوئی کبھی

خاک پر کھڑی ہوئی ہوں
سبز گھاس کی طرح
چوستا ہے میرا تن
باد و آفتاب و آب
زندگی کے واسطے

بارور ہوں آرزو سے
بارور ہوں عشق سے
خاک پر کھڑی ہوں مَیں
تاکہ تارے آسمان پر کریں ستائشیں
مجھ پہ ہوں نسیم کی نوازشیں

کھول کر دریچہ دیکھتی ہوں جب
جانتی ہوں
جُزصدائے یک ترانہ ہیں نہیں
جاودانہ ہیں نہیں

جُزصدائے یک ترانہ آرزو بھی کی نہیں
لذتِ سکوتِ غم سے پاک تر ہے یہ فغاں
میں بناؤں آشیانہ، جستجو بھی کی نہیں
میرے جسم کے تنے پہ
ایک تن ہے شبنمیں

میرے گھر کی اِس جُدار * پر جو میری زندگی ہے
عشق کے سیاہ خط سے
نقش کر چکے ہیں اپنے یادگار
رہروانِ رہگزار
تیر کھائے قلب، شمعِ واژگوں
حرفِ درہمِ جنوں
اور ان پہ نکتہ ہائے ساکت و پریدہ رنگ

میرے لب تک آئے جب کسی کے لب
نطفہ اک ستارے کا
ان سے بارور ہوا

میری رات میں چمک رہا ہے جو

رودِ یادگار پر
پس تو کس لیے ستاروں کی میں آرزو کروں

یہ ترانہ ہے مرا
دل پذیر، دل نشیں
اس سے قبل، اس سے بڑھ کے کچھ ہوا نہیں

*جُدار: دیوار

ہوا ہمیں اپنے ساتھ اڑا لے جائے گی

میری چھوٹی سی رات میں، افسوس!
درخت کے پتّوں اور ہَوا کا ساتھ
صرف ایک مختصر میعاد کے لیے ہے
میری چھوٹی سی رات میں
ویرانی کا وسوسہ شامل ہے

کان لگا کر سنو!
کیا تم اندھیرے کی سرسراہٹ سُن رہے ہو؟
اپنی خوش بختی کو مَیں
اجنبیت سے دیکھتی ہوں
میں اپنی یاس کی عادی ہو چکی ہوں
کان لگا کر سنو،
کیا تم اندھیرے کی سرسراہٹ سن رہے ہو؟

اِس لمحے، رات میں کچھ ہو رہا ہے
چاند سُرخ اور متفکر ہے
اور اس چھت پر کہ جس میں
ہمہ وقت نیچے گرنے کا دھڑکا رہتا ہے
بادل عزاداروں کے ہجوم کی طرح

برسنے کے لمحے کے منتظر ہیں
ایک لمحہ
اور اس کے بعد... نیستی
اس دریچے کے پیچھے
رات میں لرز رہی ہے
اور زمین میں
اسے گردش کرنے سے روک رہی ہے
اس دریچے کے پیچھے ایک نامعلوم
میری اور تیری جانب نگراں ہے

اے کہ تُو سراپا سبز ہے
اپنے ہاتھوں کو جلتی ہوئی یاد کی طرح
میرے عاشق ہاتھوں کے سپرد کر دے
اور اپنے لبوں کو
ہستی کے احساسِ گرم کی مانند
میرے عاشق لبوں کے مہربان لمس کے سپرد کر دے
ہوا ہمیں اپنے ساتھ اُڑا لے جائے گی
ہوا ہمیں اپنے ساتھ اُڑا لے جائے گی

آفتاب ہو گیا

یہ دیکھ غم مری نگہ میں کس طرح سے
قطرہ قطرہ آب ہو گیا
مرا یہ سرکش و سیاہ سایہ کس طرح
اسیرِ دستِ آفتاب ہو گیا
نظر تو کر
مرے وجود کے عجیب حال پر

شرارہ مجھ کو کھینچتا ہے اپنی سمت
اوج کی طرف مجھے اٹھا رہا ہے
دام اک بچھا رہا ہے
دیکھ تو ذرا
تمام آسماں مرا
پُر از شہاب ہو گیا

تُو آیا کتنی دور سے
تُو آیا سرزمینِ عطر و نُور سے
بٹھا رہا ہے مجھ کو ایک ناؤ پر
کہ جو سجی ہے عاج سے، بلور سے
اب اپنے ساتھ لے چل اے امیدِ دل نوازِ من

ایک ایسے شہر میں
جو شہرِ شعر، شہرِ شور ہے

ستارہ دار راہ پر کشاں کشاں
ستاروں سے بلند تر مقام پر بٹھا دیا
یہ دیکھ جل رہی ہوں میں ستارہ ساں
میں پُر ہوئی ستارگانِ گرم سے

زمین اس سے قبل ہم سے کتنی دور تھی
اب اس کبودی غرفۂ فلک سے
پھر سے آ رہی ہے میرے کان تک
تری صدا
فرشتوں کے پَروں کی پھڑپھڑاہٹیں
یہ دیکھ میں کہاں تک آ گئی
میں کہکشاں و بیکراں و جاوداں تک آ گئی

اور اب کہ لے کے آ گیا ہے مجھ کو اتنے اوج تک
تُو مجھ کو غسل دے شرابِ موج سے
حریرِ بوسہ میں لپیٹ دے مجھے
طویل رتجگوں میں میری چاہ کر
دوبارہ اب رہا نہ کر

دوبارہ مجھ کو ان ستاروں سے جدا نہ کر

یہ دیکھ موجِ شب ہماری رہ میں کس طرح

قطرہ قطرہ آب ہو گیا

وہ گرم لَے ترانۂ نیند کا سنا رہا ہے تُو

پیالۂ سیاہ میری چشم کا

پُراز شرابِ خواب ہو گیا

نگاہ ڈال میری شاعری کے گاہوارے پر

کہ تُو طلوع ہوتے ہوتے

آفتاب ہو گیا

حاصل

ایک ننھے سے بلبلے میں
روشنی گھِس گھِس کر ختم ہو رہی تھی
ناگہاں دریچہ رات سے بھر گیا
کھو کھلی صداؤں کے ہجوم سے سرشار رات
مسموم رات زہر آلود سانسوں سے
رات...

میں نے کان لگا کر سنا
وحشت زدہ تاریک سڑک پر
کسی شخص نے اپنے دل کو
فاسد مادّے کی طرح
ایڑی سے مَسَل دیا
وحشت زدہ تاریک سڑک پر
ایک ستارہ
پھُوٹ گیا
میری نبض طغیانیِ خون سے متورّم تھی
اور میرا بدن
پراگندہ ہو جانے کے خوف سے

چھت کے آڑے ترچھے خطوط پر
میں نے اپنی آنکھ کو دیکھا
ایک گراں ڈیل مکڑی کی مانند
اپنے کف، اپنی زردی، اپنے خفقان میں
خشک ہو رہی تھی

اتنی کروٹیں لیتے لیتے
میں ساکت پانی کی طرح
آہستہ آہستہ
تہہ میں بیٹھتی جا رہی تھی
آپ اپنے گڑھے کے اندر
اپنی تلچھٹ بنتی جا رہی تھی

میں نے غور سے سنا
میں نے غور سے اپنی پوری زندگی کو سنا
ایک مکروہ چوہا اپنے بِل میں
ایک بھدّا، مہمل راگ بے حیائی سے گا رہا تھا
ایک مسلسل
گھناونی، بے معنی آواز
چکراتی ہوئی
ایک فانی لمحے کو پار کر رہی تھی
اور سطحِ فراموشی پر رواں تھی

آہ مَیں لبریز تھی شہوت سے ـــــ
شہوتِ مرگ سے ـــــ
میرے پستانوں میں ایک سرسام آور احساس سے
ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں
آہ!
مجھے یاد آیا
اپنا اوّلیں روزِ بلوغت
جب میرے تمام اندام
ایک معصوم تحیّر میں وا ہو گئے تھے
تاکہ اُس مبہم، اُس گنگ، اُس نامعلوم میں
گھُل جائیں
ایک ننھے سے بلبلے میں
روشنی نے ایک تھرتھراتی لکیر میں
جماہی لی ـــــ

وصل

وہ سیاہ پتلیاں، آہ
وہ میرے سادہ و خلوت نشین صوفی
اس کی آنکھوں کے جذبۂ سماع میں
از خود رفتہ تھیں

میں نے دیکھا کہ وہ میرے پورے پیکر پر موجاں ہے
جیسے آگ کے سرخ رخساروں کی آنچ
جیسے پانی کا انعکاس
جیسے بارش کی تشنج میں بادل

جیسے گرم فصلوں کی سانسوں سے آسمان
کراں تا کراں
زندگی کے اُس پار تک
وہ چھایا ہوا تھا

میں نے دیکھا
اس کے ہاتھوں کی روانی میں
میرے وجود کی جسمیت
تحلیل ہو رہی ہے

میں نے دیکھا کہ اس کا دل
اپنی طلسمی تال کے ساتھ
میرے پورے دل میں بَل کھا رہا ہے

گھڑی کے پر لگ گئے
پردے کو ہوا اڑا لے گی
میں نے اسے
ایک پیاسے حلقہ میں باندھا تھا
میں نے چاہا کہ کہوں... لیکن
اس کی سیاہ پلکوں کا جھرمٹ
جیسے پردۂ ابریشم کے ریشے
تاریکی کے جڑوں سے نکل آئیں

راتوں کے اُس طول طلب دورانیے میں
وہ تشنج، وہ تشنجِ مرگ آلود
میری گم گشتہ انتہا تک

میں نے دیکھا میری جلد فرطِ انبساط سے اتری جا رہی ہے
میں نے دیکھا
میرا آتشیں جسم
آہستہ سے پانی بن گیا
اور گرنے لگا، گرنے لگا، گرنے لگا

گہرائیوں میں جہاں چاند تھا

تیرہ تار چاند

ایک دوسرے میں ہم نے آنسو بہائے تھے
وحدت کے سارے بے اعتبار لمحوں کو
ایک دوسرے میں ہم نے
دیوانہ وار جیا تھا

عاشقانہ

اے کہ شب رُخ سے ترے رنگین ہے
سینہ تیرے دَم سے عطر آگین ہے
اے کہ تُو ہے، تُو، مری نظروں کے پیش
کم دیے غم، مجھ کو خوشیاں دی ہیں بیش
جس طرح دھوتی ہے بارش جسمِ خاک
کر دیا آلودگی سے مجھ کو پاک

•

تُو تپش بن کر تنِ سوزاں میں ہے
بن کے آتش سایۂ مژگاں میں ہے
آہ، گندم زاد سے سرشار تر
شاخِ زرّیں سے کہیں پُربار تر
اے کھُلے دَر چہرۂ خورشید پر
اے ملامت ظلمت و تردید پر
ساتھ تیرے درد کی سختی نہیں
ہے اگر، جز دردِ خوش بختی نہیں

یہ مرا تاریک دل اور اتنا نُور؟
زندگی کے بھیسے اور قعرِ گور؟

آہ آنکھیں تیری میرا باغ ہیں
بن کے تیری مُہر مجھ پر داغ ہیں
پہلے ہوتا تُو اگر اس سینے میں
غیر کو میں "تُو" سمجھتی کس لیے

ہے اذیت خاکِ در در پھانکنا
پیش کرنا خود کو، ہر در جھانکنا
تِیرہ دل سینوں پہ رکھنا اپنا سر
کر رہا ہو جب کہ کِینہ دل میں گھر
ہر نوازش میں چھپا ہو قہرِ مار
مسکراہٹ میں ملا ہو زہرِ مار
اپنا زر رکھنا کفِ طرّار میں
اور بھٹکنا وسعتِ بازار میں

آہ تُو مجھ میں مری جاں کی مثال
قبر سے میری مجھے لایا نکال
تُو ستارہ ہے، ترے پَر زرنشاں
تجھ کو لایا گویا دستِ آسماں
میری تنہائی کو خاموشی ملی
جسم کو بُوے ہم آغوشی ملی
جُوے خشک سینہ میں ہے آب تُو
ہے رگوں کی سیج پر سیلاب تُو

اب چلوں گی اس جہاں میں دَم بہ دَم
تیرے قدموں سے ملا کر مَیں قدم

آہ، زیرِ جِلد یوں پنہاں ہے تُو
خون بن کر جِلد میں جوشاں ہے تُو
بال سلگائے ہیں اپنے لمس سے
گال دہکائے ہیں خواہش سے مرے
پیرہن سے میرے اے ناآشنا
صرف اِس شاداب تن سے آشنا
آہ، اے روشن طلوعِ بےغروب
آفتاب سرزمیں ہائے جنوب
آہ، تُو ہے صبح سے شاداب تر
بارشوں سے تازہ تر، سیراب تر
عشقِ تازہ یہ نہیں، ہے خِیرگی
یہ چراغاں! کیا ہوئی وہ تِیرگی؟
عشق جب سے سینے میں بیدار ہے
میری ہستی سر بہ سر ایثار ہے

مَیں نہیں، یہ مَیں نہیں، کچھ اَور ہے
حیف اُن برسوں پہ جو تنہا کٹے
میرے لب منزل گہِ بوسہ ترے
دیدہ و دل جن کے فرشِ راہ ہیں

اے تشنج لذتوں کے جسم میں
خط ترے تن کے مرا ملبوس ہیں
چاہتی ہوں مثلِ غنچہ پھوٹنا
یک بہ یک دل پر یہ کیا سایہ پڑا
جی میں آتا ہے کہ یک دم اٹھ کے جاؤں
اور بادل کی طرح آنسو بہاؤں

یہ مرا دل تنگ اور یہ دودِ عُود
یہ خموشی اور شورِ چنگ و رُود

ہے نگہ تیری وہ لوری سحر بار
سوئے گہوارے میں طفلِ بےقرار
ہیں نفس تیرے نسیمِ نیم خواب
دھو دیا ہستی سے سارا اضطراب
سو رہا ہے مسکراہٹ میں تری
میرا فردا اور کلُ دنیا مری
عشق کی بھڑکائی آتش اس طرح
شعر ہو جائیں نہ شعلے کس طرح

چابی کی گڑیا

اس سے بڑھ کر، آہ، ہاں،
اس سے بڑھ کر خاموش رہ سکتی ہے
پہروں، اس کی نگاہیں لاش کی نظروں کی طرح
ایک سگریٹ کے دھوئیں میں خیرہ ہوتی رہیں
ایک پیالی کی شکل سے محظوظ ہوتی رہیں
یا قالین پر ایک بدرنگ پھول
یا دیوار پر ایک موہوم لکیر سے

خشک ہاتھوں سے پردہ ہٹا کر دیکھ سکتی ہے
گلی میں تیز بارش ہو رہی ہے
کوئی بچہ ایک رنگین غبارہ لیے
ایک طاق کے نیچے کھڑا ہے
ایک بوسیدہ گاڑی تیزی سے شور مچاتی ہوئی
خالی میدان سے جا رہی ہے

وہ بیٹھی رہ سکتی ہے اپنی جگہ پر
پردے کے پاس، مگر اندھی اور بہری

وہ چیخ سکتی ہے
نہایت جھوٹی، نہایت اجنبی آواز میں
"مَیں محبت کرتی ہوں"
ایک مرد کی چیرہ دستی کے آگے
ایک خوب رُو، سالم مادہ بن سکتی ہے

پلاسٹک کے دستر خوان جیسے بدن کے ساتھ
درشت اور سخت پستانوں سمیت
کسی پاگل، آوارہ، نشے میں دُھت مرد کے بستر میں
ایک عشق کی عصمت آلودہ کر سکتی ہے

بڑی ہوشیاری سے تحقیر کر سکتی ہے
شگفتگی کے ہر معنے کی
اخباری معمے اکیلے ہی حل کر سکتی ہے
اور ایک لغو حل پر اپنا دل خوش کر سکتی ہے
ایک لغو حل، چھ یا پانچ حروف کا

وہ تمام عمر دوزانو رہ سکتی ہے
سر جھکائے ہوئے، ایک سرد ضریح کے سائے میں
ایک مجہول قبر میں خدا کو دیکھ سکتی ہے
ایک ناچیز سکّے سے ایمان حاصل کر سکتی ہے
کسی مسجد کے حُجرے میں گل سکتی ہے
کسی بوڑھے زیارت نامہ خواں کی مانند

صفر کی طرح
تفریق و جمع و ضرب میں
تمام عمر ایک ہی حاصل پا سکتی ہے
اپنے غصّے کے خول میں
کسی پُرانے، بدرنگ جوتے کا تکمہ چھپا کر رکھ سکتی ہے
پانی کی طرح اپنے گڑھے میں خشک ہو سکتی ہے

ایک لمحے کی خوشی کو، شرم سے
کسی سیاہ، مضحکہ خیز عکس کی طرح فوراً
صندوق کی تہہ میں چھپا سکتی ہے
ایک روز خالی دیوار پر
کسی محکوم یا مغلوب یا مصلوب کی تصویر ٹانگ سکتی ہے
تصویروں سے دیواروں کے رخنے ڈھانپ سکتی ہے
ان سے بھی پوچ تر نقوش میں گھُل مل سکتی ہے
مٹی کی گڑیا کی طرح
شیشے کی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھ سکتی ہے
سالہا ایک مخملیں ڈبے میں
کاہی زدہ بدن کے ساتھ
پنّیوں اور جھالروں کے ڈھیر میں خوابیدہ رہ سکتی ہے
اور ہرزہ دستی کی ہر چٹکی پر
بے سبب چیخ سکتی ہے
"آہ، میں بہت خوش قسمت ہوں"

جوڑا

رات آتی ہے
اور رات کے بعد تاریکی
اور تاریکی کے بعد
آنکھیں
ہاتھ
اور سانس، اور سانس، اور سانس
اور نل سے گرتے پانی کی آواز ـــــ ٹپ ٹپ ٹپ
پھر دو سُرخ نقطے
جلتے ہوئے سگریٹوں کے
گھڑی کی ٹک ٹک
اور دو دل
اور دو تنہائیاں

معشوقِ من

میرا محبوب
اپنا بے شرم برہنہ بدن لیے
فتح مند پنڈلیوں پر موت کی مانند ایستادہ ہے

بے قرار ترچھی لکیریں
اُس کے پُر بغاوت اندام کی
ٹھوس بناوٹ کا طواف کر رہی ہیں

میرا محبوب
گویا کسی بھولی بسری نسل سے ہے

جیسے کوئی تاتاری
اُس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ہمیشہ
کسی سوار کی گھات میں ہو
جیسے کوئی بربر
اُس کے پُر طراوت دانتوں کی کوندتی بجلیوں میں ہمیشہ
شکار کے گرم خون کے خیال میں غرق ہو

فطرت کی طرح
میرے محبوب کا ایک ناگزیر اور بے باک مفہوم ہے
میری شکست سے وہ
طاقت کے صادقانہ قانون کی تائید کرتا ہے
وہ وحشیانہ آزاد ہے
کسی غیر آباد جزیرے میں
ایک سالم جبلت کی مانند
وہ اپنے جوتوں پر سے رہگزاروں کا غبار
خیمۂ مجنوں کے ٹکڑوں سے صاف کرتا ہے

میرا محبوب
نیپال کے کسی مندر کے خدا کی طرح
اپنے وجود کی ابتدا سے بے گانہ ہو چکا ہے

وہ بیتے ہوئے قرنوں کا ایک مرد ہے
اور حسنِ اصیل کی یاد دلاتا ہے
وہ اپنی فضا میں
بچے کی مہک کی طرح
مسلسل معصوم یادیں بیدار کرتا ہے
وہ ایک مسرّت بھرے لوک گیت کی مانند ہے
اپنے کھردرے پن اور عریانی سے سرشار

وہ خلوص سے محبت کرتا ہے
ذرات زندگی سے
ذراتِ خاک سے
ہر غمِ آدمی سے
ہر غمِ پاک سے

وہ خلوص سے محبت کرتا ہے
گاؤں کی ایک ہری بھری پگڈنڈی سے
اور ایک درخت سے
ایک پیالہ آئس کریم سے
اور دُھلے کپڑوں کی ایک الگنی سے

میرا محبوب
سیدھا سادہ انسان ہے
ایک سیدھا سادہ انسان، جسے
منحوس عجائبات کی اس سرزمین پر
کسی عظیم مذہب کی آخری نشانی کی طرح
میں نے اپنے پستانوں کے کنج میں
چھپا رکھا ہے

غروبِ ابدی

— روز یا شب؟
— نہیں، اے محبوب، یہ غروبِ ابدی ہے
ہوا میں دو کبوتروں کے گزرنے کے ساتھ
دو سپید تابوتوں کی مانند
اور دور کی اس آواز کے ساتھ
اس اجنبی دشت سے
ہوا کی حرکت کی مانند بے ثبات و سرگرداں

کچھ بات کرنی چاہیے
کچھ بات کرنی چاہیے
میرا جی چاہ رہا ہے کہ تاریکی کے ساتھ ہم بستر ہو جاؤں
کوئی بات کرنی چاہیے

کتنی سنگین فراموشی ہے
ایک سیب شاخ سے نیچے گر رہا ہے
اور زرد کتان کے بیج
میرے عاشق کی منقار میں ٹوٹ رہے ہیں
اس دگرگوں گونگے پن کے وسوسے سے رہا ہونے کی خاطر
قالین کا پھول
اپنے کبودی اعصاب کو نسیم کے نشے کے حوالے کر رہا ہے

اور یہاں
مجھ میں؟
میرے سر میں؟

آہ...
میرے سر میں گاڑھے سُرخ ذرات کی گردش کے سوا کچھ نہیں ہے
میری نگاہ کسی جھوٹے لفظ کی طرح
شرم سار ہے اور جھک گئی ہے

میں ایک چاند کا سوچتی ہوں
میں ایک شعر کے حرفوں کا
میں ایک چشمے کا سوچتی ہوں
خاک کے واہموں کا
گندم زاروں کی غنی خوشبو کا
میں افسانۂ نان کا سوچتی ہوں
کھیلوں کی معصومیت کا
اور اس دراز، تنگ گلی کا
جو کیکر کے درختوں سے بھری ہوئی تھی
کھیل کے بعد، تلخ بیداری کا
اور کوچے سے پرے تحیّر کا
اور کیکر کی مہک سے پرے طویل خالی پن کا

— کارنامے؟

— آہ!

گھوڑے بوڑھے ہو جاتے ہیں

— عشق؟

— تنہا ہے، اور چھوٹی سی کھڑکی سے
مجنونوں سے تہی ویرانوں کو تکتا ہے
یاد میں ایک گزرگاہ ہے
جو پراگندہ ہے
ایک خرامیدہ ساقی کے
نازک گھنگھروؤں کی آواز سے

— آرزوئیں؟
خود کو وا کر دیتی ہیں
ہزاروں بے رحم دروازوں کی یکسانی میں

— بند ہیں؟
ہاں، ہمیشہ بند، بند

— تھک جاؤ گی

میں ایک گھر کا سوچتی ہوں
اس کی بیلوں کے نیم غنودہ تنفس کا
روشن اپنے چراغوں سے، آنکھ کی پُتلی کی طرح
اپنی راتوں کی سوچ میں ڈوبا ہوا، سُست، بے تشویش
اور ایک نوزائیدہ کے لامحدود تبسّم کا...

میں نیستی کے مہین غبار کا سوچتی ہوں
اور سیاہ سرسراہٹوں کی تاراج کا
اور مشکوک نور کا
جو دریچوں میں تاریکیاں تراشتا ہے
اور ایک چھوٹی سی قبر کا،
چھوٹی سی، جیسے کسی نوزائیدہ کا پیکر

— کام... کام؟
— ہاں، مگر اس وسیع میز میں
ایک خفیہ دشمن کا مسکن ہے
جو مجھے آہستہ آہستہ چبا رہا ہے
جیسے لکڑی کو، کاغذوں کو
اور ہزاروں دوسری لغو چیزوں کو
اور آخر کار
تُو چائے کی ایک پیالی کی تہہ میں جا بیٹھے گی
جیسے گرداب میں کشتی
اور افق کی پہنائیوں میں
کچھ نہ دیکھے گی، بجز
ایک سگریٹ کے گاڑھے دھویں کے
— ایک ستارہ؟
— ہاں، صدہا، صدہا، مگر
تمام اسی محصور رات میں
— ایک پرندہ؟

— ہاں، صدہا، صدہا، لیکن
صرف دور کی یادوں میں
پر پھڑپھڑانے کا عبث غرور لیے
میں گلی میں ایک چیخ کا سوچتی ہوں
اس بے ضرر چوہے کا
کہ دیوار سے گاہے گاہے گزرتا ہے

— کچھ بات کرنی چاہیے
کچھ بات کرنی چاہیے
سحر گاہوں میں، اس لمحۂ لرزاں میں
جب فضا، احساسِ بلوغت کی طرح
ناگہاں، کسی مبہم شے میں گھُل جاتی ہے
میرا جی چاہتا ہے
کہ میں خود کو طوفاں کے حوالے کر دوں
میرا جی چاہتا ہے
کہ میں اِس ابرِ گراں سے برسوں
میرا جی چاہتا ہے
کہ کہوں: نہیں، نہیں، نہیں
— آؤ چلیں
— کوئی بات کرنی چاہیے
— جام، یا بستر، یا تنہائی، یا نیند؟
— آؤ چلیں...

مُرداب *

رات کالی ہو گئی، بیمار ہے
اور کسی کی آنکھ ابھی بیدار ہے
دیکھنے سے باز کب رہتی ہے آنکھ
کچھ چھپاتی کب ہے، سب کہتی ہے آنکھ
وہ گیا، اب مرگ زارِ کہنہ ہے
میں ہوں اور یہ انتظارِ کہنہ ہے
دیکھ یہ صحرا مری تنہائی کے
اور مصنوعی یہ سیارے مرے
زاہدوں سے یہ قدیمی میری جنگ
ڈھا رہا ہے زہد کی دیوار چنگ
زندہ لیکن حسرتِ زائیدگی
مُردہ لیکن حسرتِ جاں دادگی
خود پسند اپنا نہیں غم جانتے
سوتے ہیں حسرت میں، تا ہوں اٹھ کھڑے
ان کے ہنسنے پر مجھے ہوتا ہے غم
ان کی دل پاکی پہ آ جاتی ہے شرم
اجنبی ہے ان کی ہر دل دادگی
شورِ تُندِ مرگ ہے ہم خوابگی

---

*مُرداب: دلدل

کرمِ خاک اور خاک بے حد بو‌ئناک
جیسے غبارے ہوں اور افلاکِ پاک
ناشناسِ نیمۂ پنہاں ہیں یہ
شرمسارِ چہرۂ انساں ہیں یہ
کُو بہ کُو مادہ کی ان کو جستجو
دوڑے جیسے جانور، جب پائے بُو
مل گئی گر، بے تشفی ہی رہے
مادہ ان کی سخت تنہا ان سے ہے
دونوں کو بیم و ہراسِ یک دگر
تلخ کام و ناشناسِ یک دگر
عشق ان کا رشتہ محکومانہ ہے
وصل اک رویائے مشکوکانہ ہے
آہ گر جائے سمندر کی طرف
پستیوں کی کس لیے پروا ہو تب
ہاں مگر دلدل میں پانی رک جو جائے
کیوں نہ پانی بے پنہ نقصان پائے
پھر تباہی کیوں نہ ہو گرداب میں
مچھلیاں مر جائیں ایسے آب میں

آہوؤ — اے آہوانِ دشت، تم
جاؤ گر میدان میں گلگشت کو
گنگناتی کوئی دیکھو جوئبار
ہو سمندر کو رواں دیوانہ وار

...

ہاتھ میں جس کے ایالِ باد ہو
رُوئے سرخِ ماہ جس کے ساتھ ہو
جو تنوں کی سبز رانیں کھول دے
عطرِ غنچہ کی بکارت توڑ دے
آسماں میں دیکھتا ہو ہر حباب
انعکاسِ بےدریغِ آفتاب
یاد کرنا نیند اک بےخواب کی
یاد کرنا موت اک مُرداب کی

آیہ ہائے زمینی

اُس دَم
خورشید سرد ہو گیا
اور زمین سے برکت اُٹھ گئی

اور صحرا میں ہریالی خشک ہو گئی
دریا میں مچھلیاں خشک ہو گئیں
اور اپنے مُردوں کی خاک کو
زمین نے دوبارہ قبول نہیں کیا

رات
تمام بریدہ رنگ دریچوں میں
کسی مشکوک تصوّر کی مانند
ٹھاٹھیں مارتی رہی
راستوں نے اپنی روانی کو
تیرگی میں ترک کر دیا

پھر سے کسی نے عشق کو یاد نہیں کیا
پھر سے کسی نے فتح کو یاد نہیں کیا
اور کسی نے

پھر سے کسی چیز کو یاد نہیں کیا
تنہائی کے غاروں میں
لغویت نے جنم لیا
خون سے بھنگ اور افیون کی بُو آنے لگی
حاملہ عورتیں
بے سر کے بچے پیدا کرنے لگیں
اور گھوارے شرم سے
قبروں میں پناہ ڈھونڈنے لگے

کیسا تلخ و سیاہ زمانہ...
نان نے شگفتِ رسالت کی کامرانی کو مغلوب کر لیا تھا
پیغمبر، گرسنہ و مفلوک،
خدا کی وعدہ گاہوں سے گریزاں تھے
اور گم شدہ بھیڑوں کے بچے
اس بار گڈریوں کی "بُش بُش" کو
صحراؤں کے تحیر میں نہیں سُن رہے تھے

آئینوں کی آنکھوں میں گویا
حرکات اور رنگ اور تصاویر
اُلٹے منعکس ہو رہے تھے
اور پست مسخروں کے سروں کے اوپر
اور فاحشاؤں کے بے حیا چہروں کے گرد

ایک مقدّس نورانی ہالہ
ایک چِترِ مشتعل کی مانند جل رہا تھا
الکحل کے جوہڑ
اپنی مسموم گیس کے بخارات سے
بے تحرک دانشوروں کے انبوہ کو
اپنی گہرائیوں کی سمت کھینچے لیے جاتے تھے

اور موذی چوہے
کتابوں کے زرنگار اوراق کو
قدیم الماریوں میں کتر رہے تھے

سورج مر چکا تھا
سورج مر چکا تھا، اور مستقبل
بچوں کے ذہن میں
ایک گم شدہ، گونگا مفہوم تھا

اس کہنہ لفظ کی اجنبیت کو
وہ مشق کی کاپیوں میں
درشت سیاہی کے دھبوں سے
تصویروں میں اتار رہے تھے

لوگ
استاط شدہ لوگوں کا ایک گروہ

دل مُردہ، پژمُردہ، مبہوت
اپنے بد بخت جسموں کے بوجھ تلے دبا
ایک اجنبی مقام سے دوسری اجنبی مقام کی جانب سفر کر رہا تھا
گناہ کی دردناک آرزو سے
اُن کے ہاتھ متورّم ہو گئے تھے
گاہے کوئی چنگاری، کوئی ناچیز چنگاری
اس ساکت و بے جان انبوہ کو
اندر سے پراگندہ کر دیتی
اور وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے
لوگ ایک دوسرے کے گلے
چھُریوں سے کاٹنے لگتے
اور خون کی چادر پر
نابالغ لڑکیوں کے ساتھ ہم بستر ہو جاتے
وہ اپنی وحشت میں غرق تھے
اور گناہ کاری کے خوفناک احساس نے
ان کی اندھی اور احمق روحوں کو
مفلوج کر دیا تھا

ہر سزائے موت کی تقریب پر
جب پھانسی پانے والوں کی پُر تشنج آنکھیں
کاسوں سے اُبل پڑتیں
تو یہ اپنے اندر غرق ہو جاتے

اور ایک شہوت ناک تصور سے
ان کے بوڑھے اور خستہ اعصاب میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں
لیکن، میدانوں کے کنارے ہمیشہ
آئندہ کے ان حقیر مجرموں کو دیکھیے
کہ کھڑے ہیں
اور ان کی آنکھیں خیرہ ہو رہی ہیں
پانی کے فواروں کی مسلسل بوچھاڑ سے

شاید ابھی تک
ان کی پامال آنکھوں کے پیچھے
جمود کی گہرائیوں میں
ایک نیم مُردہ، مبہم سی شے باقی ہے
جو اپنی کم زور تلاش میں
چاہتی ہے کہ پانی کی آواز کی پاکیزگی پر ایمان لے آئے

شاید... لیکن کیسا بے پایاں خلا...
سورج مر چکا تھا
اور کوئی نہیں جانتا تھا
کہ اس غمگین کبوتر کا نام
جو دلوں سے اُڑ گیا،
ایمان تھا

آہ، اے صدائے زندانی!
تیری مایوسی کا شکوہ
کیا کبھی اس لعنت زدہ رات میں
نُور کی سَمت نقب نہ لگائے گا؟
آہ، اے صدائے زندانی،
اے صداؤں کی آخری صدا!

تحفہ

میں انتہائے تاریکی سے بات کر رہی ہوں
میں انتہائے تاریکی اور انتہائے شب سے بات کر رہی ہوں
اگر میرے گھر آؤ تو اے مہرباں
ایک چراغ لانا
اور اک دریچہ
کہ میں ازدحامِ کوچۂ خوش بخت کو دیکھوں

دیدارِ شب

اور ایک چہرہ نمودار ہوا
اور دریچے کے اس پار سے مجھ سے کہنے لگا:
"وہ درست ہے جو دیکھ رہا ہے
کہ میں مثلِ احساسِ گمشدگی وحشت آور ہوں
لیکن مرے خدا
یہ کیوں کر ممکن ہے کہ مجھ سے ڈرا جائے!
مَیں — مَیں کہ کبھی بھی
کُہر آلود آسمان کی چھتوں پر
ایک ہلکے پھلکے آوارہ غبارے کے سوا کچھ نہ تھی
میرے عشق و آرزو، نفرت و درد کو
ایک قبرستان کی رات کی اجنبیت میں
ایک چوہا موت کے نام پر کتر چکا ہے"

اور ایک چہرہ نمودار ہوا
اس کے خطوط نازک اور دنبالہ دار تھے
ہَوا ان بہتے ہوے نقوش کو
لحظہ بہ لحظہ مووِد گرگوں کر رہی تھی
اس کے نرم و دراز گیسو
جو رات کی پُراسرار جنبشیں چُرالائے تھے

اور تمام وسعتِ شب میں گھُل گئے تھے،
جیسے سمندر کی تہہ میں گھاس،
دریچے کے اُس طرف رواں تھے
اور آواز دے رہے تھے:
"باور کرو،
میں زندہ نہیں ہوں"

میں اس سے پرے تاریکی کے انبار کو
اور کاج کے درخت کے نُقرئی پھول کو
اب بھی دیکھ سکتی ہوں،
آہ، مگر وہ...
وہ ان سب پر محیط لرزاں تھی
اس کا لامحدود دل بلند ہو رہا تھا
گویا سبز درختوں کی حِس تھی
اور اس کی آنکھوں کی اُڑان ابدیت تک تھی

حق تمہارے ساتھ ہے
میں نے کبھی مرنے کے بعد
جرأت نہیں کی ہے کہ آئینے میں جھانکوں
میں اس قدر مُردہ ہوں
کہ اب کوئی چیز میری موت کو پھر سے
ثابت نہیں کرتی

آہ،
جھینگر کی آواز
جو رات کی پناہ میں، چاند کی طرف رُخ کیے رو رہا تھا،
باغ کے سرے پر سُنی جا سکتی تھی؟
میں سوچتی ہوں کہ تمام ستارے
گمشدہ آسمان سے کوچ کر گئے ہیں
اور شہر— شہر کتنا خاموش تھا
میں اپنی سمت کے تمام طول میں،
بجز چند بدرنگ مجسموں
اور چند خاکروبوں کے،
جن سے کوڑے اور تمباکو کی بُو آرہی تھی،
کسی شے کے روبرو نہیں ہوئی تھی

افسوس،
میں مُردہ ہوں
اور رات بھی،
گویا پوری رات کا بہاؤ لغو ہے

وہ خاموش ہو گئی
اور اس کی دو آنکھوں کی وسعت کو
احساسِ گریہ نے تلخ اور مکدر کر دیا
"کیا تم،

جنھوں نے اپنی صورتوں کو
زندگی کے غم انگیز نقاب کے سائے میں

چھپا لیا ہے،
کبھی اس یاس آور حقیقت کے بارے میں سوچتے ہو
کہ آج کے زندہ
ایک زندہ کی نجاست سے بڑھ کر کچھ نہیں
گویا کوئی بچہ
اپنے اولیں تبسم میں بوڑھا ہو گیا ہے
اور دل ـــــ وہ غیر معتبر کتبہ
جس کی عبارت جانے کتنی بار بدلی گئی ہے
اور جس کے اصل خطوط چھین لیے گئے ہیں ـــــ
اپنے پتھر کی سند پر
دوبارہ اعتماد محسوس نہیں کرے گا

سبز واہمہ

دن بھر مَیں آئینے میں روتی رہی ہوں
بہار نے میرے دریچے کو
درختوں کے سبز واہمے کے سپرد کر دیا تھا
میرا بدن اس تنہائی کے خول میں نہیں سماتا
میرے کاغذی تاج کی بُو نے
اس بے آفتاب قلمرو کی فضا کو
آلودہ کر دیا ہے

مجھ میں سکت نہیں، اب دوبارہ سکت نہیں
گلی کی آوازیں، پرندوں کی آوازیں
اُون کے گولوں کے کھو جانے کی آوازیں
بچوں کا گریز پا شور
اور غباروں کا رقص
اپنے دھاگوں کے سِروں سے بلند ہوتے ہوئے
صابن کے جھاگ کے بلبلوں جیسے
اور ہَوا، ہَوا گویا
ہم بستری کے تاریک ترین لمحوں کی گہرائی میں ہانپتی ہوئی
میرے اعتماد کا خاموش قلعہ
اس کے حصار پر

دباو بڑھایا جارہا ہے
اور کہنہ شگافوں سے
میرے دل کو نام لے لے کر پکارا جارہا ہے

تمام دن مری نگاہ
اپنی زندگی کی آنکھوں میں گڑی رہی
ان دو مضطرب، خوف زدہ آنکھوں میں
جو میری لگاتار گھورتی نظروں سے فرار ہونا چاہتی تھیں
کسی دروغ گو کی مانند
میری پلکوں کے محفوظ گوشوں میں پناہ ڈھونڈ رہی تھیں

کہاں کی بلندی، کہاں کا اوج؟
کیا یہ تمام بل کھاتے راستے
اس ایک سرد، چُوستے دہن میں
ختم نہیں ہوجاتے؟
اے فریبی لفظو ___ تم نے مجھے کیا دیا؟
اے تپسیا، بدن کی اور خواہش کی،
اگر میں نے اپنے گیسوؤں میں ایک پھول لگالیا ہوتا
تو کیا وہ اس جعل سے، اس کاغذی تاج سے
جو میرے سر پر بُو دینے لگا ہے،
زیادہ دلفریب نہ ہوتا؟

کیوں کر بیابان کی روح نے مجھے آ لیا
اور چاند کے طلسم نے مجھے گلّے کے ایمان سے دور کر دیا
کیوں کر میرے دل کا ادھورا پن بڑھتا چلا گیا
اور کسی نصف نے اس نصف کی تکمیل نہیں کی
میں کیسے کھڑی دیکھتی رہ گئی
کہ زمین میرے دو پیروں کے نیچے
سہاروں سے تہی ہوتی جا رہی ہے
اور میرے جُفت کے بدن کی گرمی
میرے بدن کے بے سود انتظار تک چل کر نہیں پہنچتی

کہاں کی بلندی، کہاں کا اوج؟
مجھے پناہ دو، اے دھند لے چراغو!
اے شکی روشن گھرو!
جن کی آفتابی چھتوں پر
کپڑے سُوکھتے رہتے ہیں

مجھے پناہ دو، اے سادہ اور مکمل عورتو!
جن کی نازک انگلیوں کی پوریں
جلد کے اوپر، حمل کی کیف آور جنبش پر
پھرتی رہتی ہیں
اور گریبانوں کے شگافوں کی ہوائیں ہمیشہ
تازہ دودھ کی مہک شامل ہوتی ہے

کہاں کی بلندی، کہاں کا اوج؟
مجھے پناہ دو، اے جلتے ہوئے چولھو!
اے خوش بختی کی نعلو!
اے باورچی خانے کی کجلاہٹ میں تانبے کے برتنو!
اے سلائی کی مشین کے دلگیر ترنم!
اے فرش اور جھاڑو کی روزانہ تکرار!
مجھے پناہ دو، اے تمام حریص عشقو!
کہ بقا کی الم ناک آرزو
تمہارے تصرف میں آنے والے بستر کو
جادو کے پانی سے
اور تازہ خون کے قطروں سے آراستہ کرتی ہے

.

تمام دن، تمام دن
سب کی چھوڑی ہوئی، چھوڑی ہوئی
جیسے پانی پر لاشہ
میں مہیب ترین چٹانوں کی جانب بڑھتی رہی ہوں
عمیق ترین سمندری غاروں
اور خوں خوار ترین آبی درندوں کی جانب
میری پشت کے نازک مہروں میں
احساسِ مرگ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں

مجھ میں سکت نہیں، اب دوبارہ سکت نہیں
میرے قدموں کی چاپ، راستے کے انکار سے بلند ہوئی
اور میری یاس، میری روح کے صبر سے وسیع تر ہو گئی
اور وہ بہار، اور وہ واہمہ سبز رنگ
جو میرے دریچے سے گزرا کرتا تھا
میرے دل سے کہہ رہا تھا:
"دیکھ لے، تُو ذرا بھی آگے کی طرف نہیں بڑھی
تُو نیچے کی طرف بڑھی ہے"

فتحِ باغ

یہ کوّا جو ابھی اڑ کر گیا ہے
ہمارے سروں پر سے ـــــ
اُس آوارہ آشفتہ بادل کے خیالوں میں گم
جس کی آواز
ایک چھوٹے سے نیزے کی مانند
اُفق کی پہنائی ناپتی ہوئی گزری ہے،
ـــــ ہماری خبر شہر تک لے جائے گا

سب جانتے ہیں
سب جانتے ہیں
کہ میں نے اور تُو نے اس
باغ کو دیکھا
اور اس چالباز شاخ سے
جو ہماری پہنچ سے پرے تھی
سیب توڑ لیا

سب ڈرتے تھے
سب ڈرتے تھے، لیکن میں اور تُو
چراغ و آب و آئینہ سے پیوست تھے

اور نہیں ڈرے
یہ بات دو ناموں کے کمزور رشتے
کسی بوسیدہ رجسٹر کے اوراق میں ہم آغوشی کی نہیں
یہ بات تو میرے گیسوؤں کی خوش بختی کی ہے
جو مزیّن ہیں، تیرے بوسوں کے جلتے ہوئے سُرخ پھولوں سے

اس چوری میں ہمارے جسموں کا خلوص
اور ہماری عریانی کی دمک
جیسے پانی میں مچھلیوں ۔ کے فلس
بات تو زندگی کی نقرئی آواز کی ہے
جو سحر گاہوں میں
ننھے ننھے فوارے سناتے ہیں
اس سبز و سیّال جنگل میں
ہم نے ایک شب وحشی خرگوشوں سے پوچھا،
اور اس خون سرد، مضطرب سمندر میں
موتیوں سے لبریز سیپیوں سے،
اور دور دیس کے اس پُرشکوہ پہاڑ پر
جواں سال عقابوں سے پوچھا
کہ کیا کرنا چاہیے

سب جانتے ہیں
سب جانتے ہیں

ہم نے سیمرغوں کے ساکت و سرد خوابوں سے
الگ راہ نکال لی ہے
ہم نے باغیچے میں حقیقت کو پیدا کیا ہے
ایک گمنام پھول کی شرمیلی نگاہ میں
اور ایک لامحدود لمحے میں بقا کو پیدا کیا ہے
تا کہ دو سورج ہم خیرہ ہو جائیں

بات اندھیری میں خوف زدہ سرگوشیوں کی نہیں
بات تو روشن دن اور کھلے ہوئے دریچوں کی ہے
اور تازہ ہوا کی
اور آتش دان کی، کہ جس میں
تمام بے کار چیزیں جل رہی ہیں

اور زمین کی، کہ کھیتیوں سے دوبارہ بارور ہو رہی ہے
اور پیدائش کی، تکمیل کی، غرور کی
بات میرے ان عاشق ہاتھوں کی ہے
جنھوں نے زینہ بنا دیا ہے
عطر و نور و نسیم کے پیغاموں کا
راتوں کی بلندیوں میں

آ، چمن زار میں آ
اس وسیع چمن زار میں

مجھے آواز دے
گلِ ابریشم کے تنفس کی پُشت سے
جیسے ہرن اپنی مادہ کو پکارتا ہے
پردہ شدّت جذبات سے سرشار ہے
اور معصوم کبوتر
اپنے سپید بُرجوں کی بلندیوں سے
زمین کی جانب دیکھ رہے ہیں

پرندہ فقط ایک پرندہ تھا

پرندے نے کہا: "کیا دھوپ ہے، مہکار ہے
آہ!
بہار آئی ہے
اب میں اپنے جفت کی جستجو میں جاتا ہوں"

پرندہ بالکونی کی لگر سے
اُڑا، مثال پیامی،
اور چلا گیا

پرندہ چھوٹا تھا
پرندہ سوچتا نہ تھا
پرندہ اخبار نہ پڑھتا تھا
پرندے پر کوئی قرض نہ تھا
پرندہ انسانوں کو پہچانتا نہ تھا
ہوا کے رُخ پر پرندہ
خطرے کے نشانوں کے اوپر
اپنے بے خبری کی رفعت میں اُڑ رہا تھا
اور نیلے لمحوں کا
دیوانہ وار تجربہ کر رہا تھا

پرندہ، آہ، فقط ایک پرندہ تھا

اے ارضِ پُر گہر ...

میں جیت گئی
لافانی بنالیا خود کو
ایک شناختی کارڈ میں اپنا نام مزین کرلیا
اور میری ہستی ایک عدد سے مشخص ہوگئی
پس زندہ باد ۶۷۸ صادرہ ۵ ساکنِ تہران
اس کے سوا سب کچھ بیکار ہے
آغوشِ میزبان مادر وطن
پستان اس کے پُر افتخار تاریخی اسباق سے لبریز...
تہذیب و تمدن کی لوریاں
اور جھن جھن قانون کا جھنجھنا...
آہ... اس کے سوا سب بیکار ہے

فرطِ شادمانی سے
میں دریچے کے پاس گئی اور بڑے اشتیاق سے
چھ سو اٹھتر بار ہوا کو
جو گرد و غبار اور کوڑے دان کی بدبو سے منقبض تھی
اپنے سینے کے اندر کھینچا
اور چھ سے اٹھتر بار قرضے کے تمسکوں پر
اور واپسی کے تقاضوں کے نوٹسوں پر
لکھا... فروغ فرخ زاد

اس سرزمینِ شعر و گل و بلبل میں ۔
زندگی ایک بخشش ہے
وہ بھی تب
جب تیرا وجود سالہا سال بعد منظور کر لیا جائے

تو میں نے اپنی پہلی قانونی نگاہ سے
پردے کے پیچھے چھ سو اٹھتر شعرا کو دیکھا
جو بازیگروں کی طرح فقیروں کا بہروپ بھرے
کوڑے دان میں ردیف اور قافیہ ٹٹول رہے تھے
اور میرے پہلے قانونی قدم کی آواز سے
جو کیچڑ میں پڑا تھا
چھ سو اٹھتر بلبلِ مرموز
جو مزاقاً چھ سو اٹھتر کالے کوّوں کے بھیس میں ظاہر ہوئی تھیں
اختتام روز کی جانب سستی سے پرواز کر گئیں
اور میری پہلی قانونی سانس
چھ سو اٹھتر سرخ پھولوں کی مہک سے بھر گئی
جو کہ عظیم پلاسٹک کے کارخانے نے بنائے تھے

زندگی ایک بخشش ہے ہاں
شیخ ابودلقک ، کمانچہ کش فوری کے مقامِ پیدائش سے
اور شیخ اے دل اے دل تبک تبام تنبوری

شہرِ ستارگان گراں وزن ساق جو تڑو پستان
و پشتِ جلد و ہنر
گہوارۂ مولفانِ فلسفہ "ارے بابا میری جوتی سے"

عقل فرد کے مقابلوں کا اولمپک...وائے!!
سالِ نو کے نابغے کے بھونکنے کی آواز آرہی ہے
اور ملت کے برگزیدہ مفکر
جب امراء کے حضور میں حاضر ہورہے ہیں
تو ہر ایک کے سینے پر چھ سو اٹھتر برق
تندور
اور دونوں ہاتھوں میں چھ سو اٹھتر غیر استعمال شدہ
ردیفیں ہیں

اور سمجھتے ہیں کہ ان کی ناتوانی
جیب خالی ہونے کے سبب سے ہے
نادانی کی وجہ سے نہیں ہے

میں جیت گئی، واللہ جیت گئی
......
میں زندہ ہوں مانندِ زندہ رود جو کبھی زندہ تھی
......
میں یہ کرسکتی ہوں کہ آئندہ

شہر کے کوچوں میں جو قومی تحفوں سے سرشار ہیں
ٹیلی گراف کے نازک کھمبوں کے درمیان
چہل قدمی کروں
اور بصد غرور، بیت الخلاء کی دیوار پر لکھ دوں
"خط نوشتم کہ خر کند خندہ"

......

میں یہ کر سکتی ہوں کہ آئندہ
کامل اعتماد کے ساتھ
تنظیموں کی مجلس میں
یا مجلسِ سپاس و ثنا میں میہمان بن جاؤں

کیوں کہ میں پڑھتی ہوں
مجلۂ ہنر و دانش
اور خلق و کرنش
بڑی باقاعدگی سے
اور املا لکھنا بھی جانتی ہوں

میں نے عوام کے درمیان قدم رکھا
جن کے پاس اگرچہ روٹی نہیں
لیکن ایک بڑا وسیع میدان ہے
جس کی جغرافیائی حدیں
شمال میں ایک پُرطراوت و سبز میدان سے

اور جنوب میں نیستی و ہلاکت کے میدان سے
اور بھیڑ سے بھرے
علاقوں میں
توپ خانے کے میدان سے ملتی ہیں

....

میں ایسے ارفع مقام پر پہنچ گئی ہوں
کہ میرا دریچہ
زمین سے چھ سو اٹھتر میٹر بلند ہو گیا ہے
اور افتخار اسی کو ملے گا
جو اس دریچے سے
مادر وطن کی آغوش میں کود پڑے
دیوانہ وار دھڑام سے

اور اس کی آخری وصیت یہ ہو
کہ چھ سو اٹھتر سکوں کے عوض
حضرت استاد آبراھام صہبا
اُس کی حیات کی تعریف
ایک مرثیہ قافیہ "کشک" میں
تحریر فرمائیں

میں آفتاب کو دوبارہ سلام کرنے جاؤں گی

اس جوئبار کو، جو میرے اندر بہتی تھی
ان بادلوں کو، جو میری طویل سوچ تھے
باغ میں سفیدے کے درختوں کی دردانگیز نمو کو،
جو میرے ساتھ خشک فصلیں گزارتے تھے،
جھُنڈ کے جھُنڈ کوّوں کو،
جو رات کی کھیتیوں کا عطر میرے لیے تحفے میں لاتے تھے
اور اپنی ماں کو جو آئینے میں زندگی گزارتی تھی
اور میری بڑھاپے کی شکل تھی
اور زمین کو، جس کے دہکتے ہوئے اندرونی حصّوں میں
میری شہوت تکرار سبز بیجوں کے انبار لگا دیتی تھی
دوبارہ سلام کرنے جاؤں گی

میں آ رہی ہوں، آ رہی ہوں، آ رہی ہوں
میرے گیسوؤں میں، زیرِ خاک بُو کا بہاؤ
میری آنکھوں میں، دبیز تاریکی کے تجربے
وہ پھول لیے جو میں نے توڑے
دیوار کے پار جنگلوں سے

میں آ رہی ہوں، آ رہی ہوں، آ رہی ہوں
اور دہلیز عشق سے پُر ہو رہی ہے
اس دہلیز پر
محبت کرنے والوں کو
اور ایک لڑکی کو، جو ابھی تک وہاں عشق کی دہلیز پر کھڑی ہے،
میں دوبارہ سلام کرنے جاؤں گی

میں تم سے مر رہی تھی

میں تم سے مر رہی تھی
مگر تم میری زندگانی تھے
تم میرے ساتھ جاتے تھے
تم میرے اندر گاتے تھے
جب میں سڑکوں پر
بے مقصد پھرتی تھی
تم میرے ساتھ جاتے تھے
تم میرے اندر گاتے تھے
تم دریائے ناروُن سے آنے والی
عاشق چڑیوں کو
صبح دریچے میں دعوت دیتے تھے
جب دوبارہ رات ہو جاتی تھی
جب رات ختم نہیں ہو پاتی تھی
تم دریائے ناروُن سے آنے والی
عاشق چڑیوں کو
صبح دریچے میں دعوت دیتے تھے

تم ہمارے کوچے میں
اپنے چراغ لیے آتے تھے

جب بچے جا رہے ہوتے تھے
اور کیکر کے خوشے سو رہے ہوتے تھے
اور میں آئینے میں تنہا رہ جاتی تھی
تم اپنے چراغ لیے آتے تھے .

تم اپنے ہاتھ بخشتے تھے
تم اپنی آنکھیں بخشتے تھے
تم اپنی مہربانی بخشتے تھے
جب میں بھوکی ہوتی تھی
تم اپنی زندگانی بخشتے تھے
تم مثلِ نُور سخی تھے

تم سُرخ پھول توڑتے تھے
اور میرے بالوں کو ڈھانپتے تھے
جب میرے گیسو عریانی سے لرز رہے ہوتے تھے
تم سُرخ پھول توڑتے تھے

تم اپنے رخسار چسپاں کر دیتے تھے
میرے پستانوں کے اضطراب پر
جب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہتا تھا
تم اپنے رخسار چسپاں کر دیتے تھے
میرے پستانوں کے اضطراب پر

اور کان لگا کر سنتے تھے
خون کو جو نالہ کناں بہہ رہا ہوتا تھا
اور عشق جو گریہ کناں مر رہا ہوتا تھا

تم کان لگا کر سنتے تھے
مگر مجھے نہیں دیکھتے تھے

دوسرا جنم

میری کُل ہستی ایک آیۂ تاریک ہے
جو اپنے اندر تمہاری تکرار کرتی ہوئی
تمہیں اس ابدی سحر گاہ تک لے جائے گی
جہاں غنچے شگفتہ ہوتے رہتے ہیں
اور کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں
میں نے اس گیت میں تمہیں آہ میں کھینچا ہے، آہ
میں نے اس گیت میں تمہیں
درخت و آب و آتش سے پیوند کیا ہے

زندگی شاید
ایک طویل سڑک ہے
جس پر کوئی عورت ہر روز
ایک ٹوکری اٹھائے گزرتی ہے
زندگی شاید ایک رسّی ہے
جس سے کوئی شخص خود کو لٹکا لیتا ہے
زندگی شاید کوئی بچّہ ہے
جو مدرسے سے واپس آرہا ہے
زندگی شاید
دو ہم آغوشیوں کے درمیان

سست فاصلوں میں
سگریٹ کا سلگانا ہے
یا کسی حواس باختہ راہ رو کا راستا پار کرنا
جو سر سے کلاہ اُٹھا کر، بے معنی ہنسی کے ساتھ
کسی دوسرے راہ رو کو
"صبح بخیر" کہہ رہا ہے

زندگی شاید وہ لمحۂ مسدود ہے
جس میں میری نگاہیں
تیری پتلیوں میں خود کو ویران کرتی ہیں
اور اس میں یہ احساس
کہ میں چاند کے ادراک
اور ظلمت کی دریافت کی
ان میں آمیزش کر دوں گی

اس کمرے میں جو ایک تنہائی بھر ہے
میرا دل،
جو ایک عشق بھر ہے،
اپنی خوش بختی کے سادہ بہانے ڈھونڈتا ہے
گل دان میں پھولوں کے مُرجھانے کے حُسن میں
اس پودے میں جو تم نے ہمارے گھر کے باغ میں لگایا تھا
اور ان زرد بلبلوں کی آواز میں
جو ایک دریچہ بھر گیت گا رہی ہیں

آہ،

میرا حصّہ بس اتنا ہے

میرا حصّہ بس اتنا ہے

میرا حصّہ

آسمان ہے جسے ایک پردے کا آویزاں کرنا ہی مجھ سے چھین لیتا ہے

میرا حصّہ ایک متروک زینے سے نیچے اترنا ہے

اور کسی شے کی بوسیدگی اور بے کسی سے وصل کرنا

میرا حصّہ یادوں کے باغ میں اُداس پھرنا ہے

اور اس صدا کے اندوہ میں جان دینا جو کہتی ہے:

"میں تمہارے ہاتھوں سے پیار کرتا ہوں"

میں اپنے ہاتھوں کو باغیچے میں بو رہی ہوں

میں سبز ہو جاؤں گی، میں جانتی ہوں، جانتی ہوں، جانتی ہوں

اور ابابیلیں میری روشنائی بھری انگلیوں کے گڑھوں میں

تخم ڈال جائیں گی

میں اپنے دونوں کانوں میں

چیری کے دو ہم زاد شگوفوں کے آویزے پہن رہی ہوں

اور اپنے ناخنوں پر

گلِ کوکب کی پتّیاں چسپاں کر رہی ہوں

ایک کوُچہ ہے، کہ جس میں
لڑکے، جو مجھ پر عاشق تھے، اب بھی
ویسے ہی پریشاں بال، پتلی ٹانگیں اور گردنیں لیے
ایک لڑکی کا معصوم تبسّم یاد کرتے ہیں
جسے ایک شب
ہوا اپنے ساتھ اُڑا لے گئی

وہ کوُچہ اب بھی ہے، جسے میرا دل
بچپن کے محلوں سے چُرا لایا ہے

وقت کی لکیر پر مادّے کا سفر
وقت کی خشک لکیر کو مادّے سے حاملہ کرنا
مادّہ اس تصویر سے آگاہ
جو ایک آئینے کا مہمان رہ کر لوٹ رہا ہے

اور اسی طرح ہوتا ہے
کہ کوئی مر جاتا ہے
اور کوئی رہ جاتا ہے

کوئی صیّاد ایسی جُوئے حقیر سے
جو کسی گڑھے میں جا گرتی ہو،
مروارید نہیں پکڑ سکتا

میں ایک چھوٹی سی غمگین پری کو جانتی ہوں
جو ایک سمندر میں رہتی ہے
اور اپنے دل کو ایک چوبی نَے پر
آہستہ آہستہ گاتی رہتی ہے
وہ چھوٹی سی غمگین پری
ہر رات ایک بوسے سے مر جاتی ہے
اور صبح دم
ایک بوسے سے زندہ ہو جائے گی

چلو آغازِ فصلِ سرد پر ایمان لے آئیں

اور یہ ہوں مَیں
اک زنِ تنہا
فصلِ سرد کی دہلیز پر
آغاز اور اک کرتی ہوئی
زمین کی آلودہ ہستی کا
اور اس سادہ و غمناک آسمان کی یاس کا
اور ان سیمنٹ کے ہاتھوں کی ناتوانی کا

وقت گزرا
وقت گزرا اور گھنٹا چار بار بجا
چار بار بجا
آج سردیوں کا پہلا دن ہے
میں موسموں کے راز جانتی ہوں
اور لمحوں کے حرف پہچانتی ہوں
نجات دہندہ قبر میں پڑا سو رہا ہے
اور خاک،
خاک میں ملنے والوں کو
اُس کے آرام میں خلل نہ ڈالنے کا اشارہ دے رہی ہے

وقت گزرا اور گھنٹا چار بار بجا
گلی میں ہوا چل رہی ہے
گلی میں ہوا چل رہی ہے
اور پھولوں کی جفت گیری سے
مجھے خیال آتا ہے
لاغر اور کم خون ڈنٹھلوں والے غنچوں کا
اور یہ تھکا ہوا دِق زدہ وقت
اور وہ آدمی جو بھیگے ہوئے درختوں کے پاس گزر رہا ہے
وہ آدمی جس کی نیلی رگوں کی رسّیاں
مُردہ سانپوں کی طرح اس کے گلو سے
اوپر کی سمت اٹھی ہوئی ہیں
اور اس کی آشفتہ کنپٹیوں میں
اس خونیں تمثیل کی تکرار کر رہی ہیں
سلام...
سلام...
اور پھولوں کی جفت گیری سے مجھے خیال آتا ہے

فصلِ سرد کی دہلیز پر
آئینوں کی محفلِ عزا میں
اور سوگوار، بدرنگ تجربوں کے اجتماع میں
اور دانشِ سکوت سے باروَر اس غروب میں
یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس طرح چلنے والے کو

صابر،

بوجھل،

سرگرداں،

فرمان ملے کہ وہ رُک جائے

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص سے کہا جائے کہ وہ زندہ نہیں ہے،
وہ کبھی بھی زندہ نہیں تھا

گلی میں ہوا چل رہی ہے
کوّے تنہا، اکیلے اکیلے
بڑھاپے اور بے مزگی کے باغ میں چکّر کاٹ رہے ہیں
روشن دان کی بلندی
کس قدر حقیر ہے
ایک دل کی ساری سادہ لوحی کو
وہ اپنے ساتھ ایک داستانوں کے محل میں لے جاتے ہیں
اور اب دوبارہ...
دوبارہ کیسے ایک شخص رقص کے لیے کھڑا ہو گا
اور اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو
بہتے پانی میں ڈالے گا
اور سیب کو جو بالآخر توڑا گیا ہے اور اب
سڑ گیا ہے
اپنی ایڑی تلے مَسل دے گا

اے یار، اے یگانہ ترین یار
کس قدر سیاہ آبر خورشید کی میزبانی کے انتظار میں ہیں!

لگتا ہے ابھی پرواز تشکیل کی راہ ہی میں تھی کہ ایک روز
پرندہ نمودار ہو گیا
لگتا ہے تخئیل کے سبز خطوط تھے
یہ تازہ پتّے جو نسیم کی شہوت میں ہانپ رہے تھے
لگتا ہے
وہ بنفشے کا شعلہ جو در بچے کے پاک ذہن میں جل رہا تھا
ایک چراغ کے معصوم تصوّر کے سوا کچھ نہ تھا

گلی میں ہوا چل رہی ہے
یہ ابتدائے ویرانی ہے
جس دن تمہارے ہاتھ ویران ہو گئے تھے اُس دن بھی
ہوا چل رہی تھی
اور پیارے ستارے
پیارے گتّے کے ستارے
...

ہم ہزاروں برس کے مُردوں کی مانند ایک دوسرے سے ملے ہیں
اور اُس وقت سورج ہمارے جسموں کی تباہی کی
منصفی کرے گا

میں ٹھنڈی پڑی ہوئی ہوں
میں ٹھنڈی پڑی ہوئی ہوں اور لگتا ہے
اب کبھی گرم نہیں ہو سکوں گی

اے یار، اے یگانہ ترین یار، "وہ شراب کیا
چند سالہ تھی؟"
ذرا دیکھ کہ اِس جگہ
وقت کتنا وزنی ہے
اور مچھلیاں کس طرح میرا گوشت چبا رہی ہیں
تم ہمیشہ مجھے سمندروں کی تہہ میں کیوں رکھتے ہو؟
میں ٹھنڈی پڑی ہوئی ہوں اور صدف کے گوشواروں سے بیزار ہوں
میں ٹھنڈی پڑی ہوئی ہوں اور جانتی ہوں
کہ ایک جنگلی پھول کے تمام سُرخ واہموں میں سے
جز چند قطرۂ خون
کچھ بھی باقی نہ بچے گا

میں لکیروں کو رہا کر دوں گی
اور اسی طرح اعداد کے شمار کو بھی رہا کر دوں گی
اور محدود ہندسوں کی شکلوں کے درمیان
وسعت کے احساس کی پہنائیوں میں پناہ لوں گی
میں عریاں ہوں، عریاں ہوں، عریاں ہوں
محبت کے کلام کے درمیان سکوت کی طرح عریاں

اور میرے تمام زخم عشق سے ہیں
عشق، عشق، عشق سے
اس سر گرداں جزیرے کو
میں سمندروں کے طوفانوں
اور شق ہوتے ہوئے پہاڑوں سے گزار کر لائی ہوں
اور پرزہ پرزہ ہو جانا
اس متحد وجود کا راز تھا
جو آفتاب کے حقیر ترین ذرّوں سے پیدا ہوا

سلام اے شبِ معصوم
سلام اے شب، کہ بیاباں کے بھیڑیوں کی آنکھوں کو
ہڈیوں کے سوراخوں میں،
ایمان اور اعتماد میں بدل دیتی ہے
اور تیری جوئباروں کے کنارے
درختوں کی روحیں
کلہاڑیوں کی مہربان روحوں کی بُو سونگھتی ہیں
میں خیال و حرف و صدا کے ایک بے تفاوت جہان سے آ رہی ہوں
اور یہ جہاں سانپوں کے بِلوں کی مانند ہے

اور یہ جہاں لوگوں کے قدموں کی چاپ سے لبریز ہے
جو کہ جب تجھے بوسہ دیتے ہیں
تو اپنے ذہن میں تیری پھانسی کی رسّی بٹتے ہیں

سلام اے شب معصوم!
دریچے اور دید کے درمیان
ہمیشہ فاصلہ ہوتا ہے
میں کیوں نہ دیکھ پائی
جیسے اُس وقت جب ایک آدمی
بھیگے ہوئے درختوں کے پاس سے گزر رہا تھا
میں کیوں نہ دیکھ پائی
لگتا ہے، میری ماں اُس رات روئی تھی
اُس رات جب میں درد تک پہنچی اور نطفے نے شکل اختیار کی
اُس رات جب میں کیکر کے خوشوں کی دُلھن بنی

...

اور وہ جو میرا نصف تھا، میرے نطفے میں پلٹ رہا تھا
اور میں نے آئینے میں اُسے دیکھا تھا
کہ مثلِ آئینہ پاکیزہ تھا اور روشن تھا
اور اُس نے ناگہاں مجھے آواز دی تھی
اور میں کیکر کے خوشوں کی دُلھن بن گئی تھی

لگتا ہے اُس رات میری ماں روئی تھی
اس مسدود دریچے سے کیسی بے ہودہ روشنی سر نکال رہی ہے
میں کیوں نہ دیکھ پائی
خوش بختی کے تمام لمحے جانتے تھے
کہ تیرے ہاتھ ویران ہو جائیں گے

اور میں نہ دیکھ پائی
اُس وقت تک نہیں، جب ساعتوں کا دریچہ وا ہوا
اور وہ غمگین پرندہ چار بار چلّایا
اور وہ چھوٹی سی عورت میرے رو برو آ گئی
جس کی آنکھیں بیسر غوں کے خالی گھونسلوں کی طرح تھیں
اور وہ سب کچھ جو اُس کی رانوں کی حرکت میں گزر رہا تھا
گویا
میرے پُر شکوہ پیکر کی بکارت کو
اپنے ساتھ بسترِ شب کی طرف لیے جا رہا تھا

کیا میں دوبارہ اپنے گیسوؤں میں
ہواؤں سے کنگھا کروں گی؟
کیا دوبارہ باغیچے میں بنفشہ لگاؤں گی؟
اور ارغوانی پھولوں کو
دریچے کے پار آسمان میں رکھوں گی؟
کیا میں دوبارہ پیمانوں پر رقص کروں گی؟
کیا دوبارہ دروازے کی گھنٹی مجھے
آواز کے انتظار کی سمت لے جائے گی؟

میں نے اپنی ماں سے کہا: اب سب کچھ ختم ہو گیا
میں نے کہا: ہمیشہ سوچنے سے پہلے
ہونی ہو جاتی ہے
اب تو اخبار میں تعزیت نامہ بھیجنا چاہیے

کھو کھلا انسان

کھو کھلا انسان، پُر اعتماد
ذرا دیکھو کہ اس کے دانت
چباتے ہوئے کس طرح راگنی گاتے ہیں
اور اس کی آنکھیں
حیرت کے وقت کس طرح پھٹ جاتی ہیں
اور وہ کس طرح بھیگے ہوئے درختوں کے پاس سے
گزرتا ہے

صابر،
بوجھل،
سرگرداں،
چار بجے
اُس لمحے کہ اس کی نیلی رگوں کی رسیاں
مُردہ سانپوں کی طرح اس کے گلے سے
اوپر اٹھی ہوئی ہوتی ہیں
اور اس کی منضطرب کنپٹیوں میں اس خونیں تمثیل کی
تکرار کرتی ہیں:
سلام...
سلام...

کیا تم نے
کبھی بھی ان چار لالہ کے پھولوں کو سونگھا ہے؟

وقت گزرا

وقت گزرا اور رات کیکر کی تحت تحت شاخوں پر گر پڑی
رات دریچے کے شیشے کے پار پھسل رہی ہے
اور اپنی سرد زبان سے
باقی ماندہ گزرا ہوا دن باہر کھینچ رہی ہے

میں کہاں سے آ رہی ہوں؟
میں کہاں سے آ رہی ہوں
کہ یوں رات کی بُو سے لبریز ہوں؟
ہنوز اُس کے مزار کی خاک تازہ ہے
میں دو سبز و جوان ہاتھوں کے مزار کی بات کر رہی ہوں
کتنے مہربان تھے اے یار، اے یگانہ ترین یار
تم کتنے مہربان تھے جب جھوٹ بولتے تھے
کتنے مہربان تھے جب آئینوں کی پلکیں موندتے تھے
اور فانوسوں کو
ان کی سیمیں شاخوں سے چُنتے تھے
اور ظالم تاریکی میں مجھے عشق کی چراگاہ کی طرف لے جاتے تھے
حتیٰ کہ وہ منتشر دھواں، جو ایک آتشیں پیاس کی
آخری ہچکی تھا
نیند کے چمن زار پر اتر آیا

وہ گنتے کے ستارے
کسی لامحدودیت کے گرد چکر کاٹ رہے تھے
کلام کو صدائیں کیوں کھتے تھے؟
نگاہ کو دیدار کے گھر مہمان کیوں کرتے تھے؟
سہلانے کو
کنوارپن کے بالوں کی حیا تک کیوں لے جاتے تھے؟
ذرا دیکھو کہ اس جگہ اس کی جان
جس نے کلام سے باتیں کیں
اور نگاہ سے مہربان لمس دیا
اور مہربان لمس سے رَم کرنا ترک کر دیا
کس طرح شک کے تختے پر مصلوب ہے
اور تمہاری انگلیوں کے پنج شاخے کے نشان
جو کبھی حقیقت کے پانچ حروف کی مانند تھے
اُس کے رخسار پر کس طرح بنے رہ گئے ہیں

سکوت کیا ہے، کیا ہے، کیا ہے، اے یگانہ ترین یار؟
سکوت کیا ہے بجز حرف ہائے ناگفتہ؟
میں کچھ نہ بولوں گی، مگر چڑیوں کی زبان
زندگی کے مسلسل جملے، فطرت کے جشن کی زبان ہے
چڑیوں کی زبان، یعنی بہار، برگ، بہار
چڑیوں کی زبان، یعنی نسیم، عطر، نسیم
چڑیوں کی زبان کارخانے میں مر جاتی ہے

یہ کون ہے جو جادۂ ابدیت پر
لحظۂ توحید کی جانب رواں ہے
اور ہمیشگی کی گھڑی میں
تفریق و تفرقہ کی ریاضی کی منطق کی چابی بھر رہی ہے
یہ کون ہے، یہ جو مرغوں کی آواز کو
دن کے دل کی دھڑکن کا آغاز نہیں سمجھتی
آغاز بوئے ناشتہ سمجھتی ہے
یہ کون ہے جس کے سر پر عشق کا تاج رکھا ہے
اور جو عروسی لباس میں گل گئی ہے
پس تو بالآخر آفتاب
ایک ہی وقت میں
دو نا امید قطبین پر نہیں چمکتا

...

اور میں اس قدر لبریز ہوں کہ میری صدا کے اوپر نماز پڑھی جا رہی ہے...

خوش قسمت جنازے
ملول جنازے
خاموش اور متفکر جنازے
خوش پوش و خوش خوراک جنازے
معین اوقات کے لیے انتظار گاہوں میں
عارضی روشنی کے مخصوص عرصے میں

لغویت کے فاسد میووں کو خریدنے کی شہوت

آہ،

کس قدر لوگ چاروں راستوں پر حادثوں کے نگراں ہیں
اور یہ رک جانے کا حکم دیتی ہوئی ہر طرف سیٹیاں
اس لمحے میں ہیں جب کہ ضرور ضرور ضرور
کوئی شخص وقت کے پہیے کے نیچے کچل کر ڈھیر ہو گیا ہے
وہ شخص جو بھیگے ہوئے درختوں کے پاس سے گزر رہا ہے

میں کہاں سے آرہی ہوں؟
میں نے اپنی ماں سے کہا: اب سب کچھ ختم ہو گیا
میں نے کہا: ہمیشہ سوچنے سے پہلے
ہونی ہو جاتی ہے
اب تو اخبار میں تعزیت نامہ بھیجنا چاہیے

سلام اے تنہائی کی اجنبیت
میں کمرے کو تیرے حوالے کرتی ہوں
کیوں کہ اندھیرے بادل ہمیشہ
تطہیر کی تازہ آیتوں کے پیغمبر ہوتے ہیں
اور ایک شمع کی شہادت میں
وہ منور راز ہے جس کو
یہ آخری کشیدہ ترین شعلہ خوب جانتا ہے

چلو ایمان لے آئیں

چلو آغازِ فصلِ سرد پر ایمان لے آئیں

چلو، ایک ناکارہ، الٹی درانتی سے

اور مقید دانوں سے

ویران شدہ تخیّل کے چمن زاروں پر ایمان لے آئیں

دیکھو کیسی برف گر رہی ہے...

شاید حقیقت دو جوان ہاتھ تھی، وہ دو جوان ہاتھ

جو لگاتار برف باری میں دفن ہو گئے

اور دوسرے برس، جب بہار

دریچے کے پیچھے آسمان کے ساتھ ہم خواب ہو رہی ہو گی

وہ اس کے تن سے فواروں کی طرح

سبز و سبک بار ڈنٹھل بن کر پھوٹیں گے

اور شگوفے دیں گے اے یار، اے یگانہ ترین یار

چلو آغازِ فصلِ سرد پر ایمان لے آئیں

تیرے بعد

تیرے بعد، اے میری سات سالہ عمر
اے مسافرت کی گھڑی،
تیرے بعد جو کچھ گزرا
جنون و جہالت کی نذر ہوا
تیرے بعد دریچہ، جو نہایت زندہ اور نہایت روشن رابطہ تھا
ہمارے اور پرندے کے درمیان
ہمارے اور تازہ ہوا کے درمیان
ٹوٹ گیا
ٹوٹ گیا
ٹوٹ گیا
تیرے بعد وہ مٹی کی گڑیا
جو صرف پانی، پانی، پانی کہتی تھی
پانی میں غرق ہو گئی
تیرے بعد میں نے جھینگروں کی آواز کو قتل کر دیا
اور الف بے کے حروف پر بجنے والے گھنٹے
اور کارخانوں کی سیٹیوں سے دل لگا لیا
تیرے بعد ہمارے کھیلنے کی جگہ، جو میز کے نیچے تھی،
میز کے نیچے سے
میز کے پیچھے تک

اور میز کے اوپر تک جا پہنچی
میں نے میز پر کھیل کھیلا
اور پھیکا کر دیا، تیرا رنگ پھیکا کر دیا اے مری سات سالہ عمر

تیرے بعد، وہ جو ایک دوسرے کے قاتل تھے
عشق کے منصف بن بیٹھے
اور وہ بھی جن کے دل ان کی جیبوں سے جھانک رہے تھے
عشق کی حصہ رسدی کے منصف بن بیٹھے

تیرے بعد میں نے قبرستانوں کا رُخ کیا
اور موت نانی کی چادر کے نیچے لمبے لمبے سانس لینے لگی
اور موت وہ تناور درخت تھی
کہ زندہ اس کے اس سِرے پر
اس کی شاخوں پر مُرادوں کے تعویذ باندھتے تھے
اور مُردہ اس کے اُس سِرے پر
گھونگھریالی جڑوں کا ساز بجاتے تھے

اور موت ایک مقدس ضریح کے نیچے بیٹھی تھی
اور اس کے چاروں زاویوں میں اچانک
چار نیلے کنول روشن ہو جاتے تھے

ہوا کی آواز آرہی ہے
ہوا کی آواز آرہی ہے، اے میری سات سالہ عمر
میں اٹھتی ہوں اور پانی پیتی ہوں
اور اچانک یاد کرتی ہوں
کہ تیرے کم سن کھیت ٹڈی دل سے کتنا ڈرتے تھے
کتنی ادائیگی لازمی ہے؟
کتنی لازمی ہے
سیمنٹ کے مکعب کی پرورش کے لیے ادائیگی؟

ہم نے ہر وہ چیز
جسے چھوڑ سکتے تھے، چھوڑ دی
ہم بے چراغ راہ پر چل کھڑے ہوئے

اور چاند، چاند،
وہ مادہ مہربان وہاں ہمیشہ ہوتی تھی
تیری بچپن کی یادوں میں، مٹی سے لپی ہوئی ایک چھت کے نیچے
اور تیرے کم سن کھیتوں پر، جو ٹڈی دل سے ڈرتے تھے
کتنی ادائیگی لازمی ہے؟

دریچہ

ایک دریچہ دیکھنے کے لیے
ایک دریچہ سننے کے لیے
ایک دریچہ کنویں کے حلقے کی مانند
انتہائی گہرائی میں زمین کے دل تک پہنچتا ہے
اور کھلتا ہے
اُس مہربان دوبرے نیلے رنگ کی وسعت کی جانب
ایک دریچہ کہ تنہائی کے چھوٹے سے ہاتھ کو
کرم کرنے والے ستاروں کے
عطر کی شبانہ بخشش سے سرشار کرتا ہے
...

میں گڑیوں کی سرزمین سے آرہی ہوں
کاغذی درختوں کے سائے میں سے
ایک باتصویر کتاب کے باغ میں
عشق و محبت کے بنجر تجربوں کے خشک موسموں سے
خاک معصومیت کے کوچے میں
بدرنگ الف بے کے حروف کی تعلیم کے برسوں سے
اس دِق زدہ مدرسے کی میز کے عقب سے
اس لمحے سے کہ جب بچے

سیاہ تختے پر لفظ "سنگ" لکھ سکتے تھے
اور سراسیمہ تیتر کہن سال درختوں سے اُڑجاتے تھے

میں آدم خود نباتات کی جڑوں سے آ رہی ہوں
اور میرا مغز ہنوز
اُس پروانے کی وحشت بھری صدا سے لبریز ہے
جسے ایک رجسٹر میں ایک پن سے
مصلوب کر دیا گیا تھا

جس دَم میرا اعتماد عدل کی کمزور رسّی سے لٹکا ہوا تھا
اور پورے شہر میں
میرے دل کے چراغ ٹکڑے ٹکڑے کیے جا رہے تھے
جس دَم میرے عشق کی معصوم آنکھوں پر
تاریک قانونوں کے رومال کی پٹّی باندھی جا رہی تھی
اور میری مضطرب آرزو کی کنپٹیوں سے
خون کے فوارے چھُوٹ رہے تھے
جس دم میری زندگی ہیچ تھی
ہیچ، بجز دیواری گھڑی کی ٹک ٹک کے،
میں نے دریافت کیا تھا کہ مجھے کرنا ہے، کرنا ہے، کرنا ہے
دیوانہ وار پیار

ایک دریچہ میرے لیے کافی ہے
ایک دریچہ — لحظۂ آگاہی اور نگاہ اور سکوت کے لیے
اخروٹ کے پودے نے
اب اس قدر قد نکال لیا ہے
کہ اپنے جوان پتّوں کو
دیوار کے معنی بتا رہا ہے
تم آئینے سے پوچھو
اپنے نجات دہندہ کا نام
کیا وہ زمین جو تمہارے قدموں کے نیچے لرز رہی ہے
تم سے زیادہ تنہا نہیں ہے؟
پیغمبر رسالتِ ویرانی کو
کیا قرنوں سے خود اپنے ساتھ لا رہے ہیں؟
یہ پیاپے دھماکے
کیا مقدس آیتیں ہیں؟
اے دوست، اے برادر، اے ہم خوں
جس وقت چاند پر پہنچو
پھولوں کے قتلِ عام کی تاریخ لکھنا

خواب، ہمیشہ،
اپنی سادہ لوحی کی بلندی سے گرتے ہیں اور مر جاتے ہیں
مجھے چار پنکھڑیوں والے شب در کی خوشبو آ رہی ہے
جو کہنہ مفاہیم کی قبر پر اگا ہے

وہ عورت جو اپنے انتظار
اور عصمت کے کفن میں خاک ہو گئی
کیا میری جوانی تھی؟
کیا میں دوبارہ اپنے تجسس کا زینہ پار کرتی ہوئی
اوپر جاؤں گی
کہ اچھے خدا کو، جو ہماری چھت پر ٹہل رہا ہے،
معلوم کروں؟

مجھے احساس ہے کہ وقت گزر چکا ہے
مجھے احساس ہے کہ "لمحہ"
تاریخ کے پتوں میں میرا حصہ ہے
مجھے احساس ہے کہ میز میرے گیسوؤں
اور اس غمگین اجنبی کے ہاتھوں کے درمیان ایک مصنوعی فاصلہ ہے

مجھ سے کوئی بات کر
وہ جو تجھے ایک زندہ جسم کی مہربانی بخش رہی ہے
تجھ سے
صرف زندہ ہونے کے احساس کے سوا اور کیا چاہے گی؟

مجھ سے کوئی بات کر
میں دریچے کی پناہ میں ہوں
اور آفتاب سے میرا رابطہ ہے

میرا دل باغ کے لیے جلتا ہے

کسی کو پھولوں کی فکر نہیں
کسی کو مچھلیوں کی فکر نہیں
کوئی نہیں چاہتا
باور کرے کہ باغ جو تھا
اب مر رہا ہے
کہ باغ کا دل دھوپ میں متورّم ہو گیا ہے
کہ باغ کا ذہن جو تھا
آہستہ آہستہ
سبز یادوں سے تہی ہوتا جا رہا ہے
اور باغ کی حِس شاید
ایسی مجرّد شے تھی کہ
باغ کی تنہائی میں گل گئی ہے

ہمارے گھر کا قدیم آنگن تنہا ہے
ہمارے گھر کا قدیم آنگن
ایک ابرِ ناشناس کے برسنے کے انتظار میں
جماہی لے رہا ہے
اور ہمارے گھر کی حوض خالی ہے

چھوٹے چھوٹے ناتجربہ کار ستارے
درختوں کی بلندیوں سے خاک پر گرتے ہیں
اور بدرنگ مچھلی گھر کی کھڑکیوں سے
راتوں کو کھانسنے کی آوازیں آتی ہیں
ہمارے گھر کا آنگن تنہا ہے

باپ کہتا ہے:
"اب میرا یہ کام نہیں
اب میرا یہ کام نہیں
میں نے اپنا بار اُٹھایا
اور اپنا کار کیا"
اور اپنے کمرے میں، صبح سے غروب تک
یا شاہنامہ پڑھتا ہے
یا ناسخ التواریخ
باپ ماں سے کہتا ہے:
"لعنت ماہی و مرغ پر
جب میں مروں گا
تب کیا فرق پڑے گا
کہ باغیچہ ہوتا تھا
یا باغیچہ نہیں ہوتا تھا
میرے لیے پنشن کا حکم کافی ہے"

ماں کی پوری زندگی
ایک جاے نماز ہے
وحشتِ دوزخ کی راہداری میں بچھائی ہوئی
ماں ہمیشہ ہر چیز کی تہہ میں
معصیت کے نشان ٹٹولتی رہتی ہے
اور اس فکر میں پڑی رہتی ہے کہ
ایک پودے کے کفر نے
باغیچے کو آلودہ کر دیا ہے
ماں تمام دن دعائیں پڑھتی رہتی ہے
ماں ایک طبعی گناہ گار ہے
اور تمام پھولوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہے
اور تمام مچھلیوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہے
اور اپنے آپ پر بھی پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہے
ماں ظہور کے انتظار میں ہے
اور بخشش کے، جو نازل ہو جائے گی

میرا بھائی باغیچے کو قبرستان کہتا ہے
اور جنگلی گھاس کی فراوانی پر ہنستا ہے
اور مچھلیوں کے جنازوں کو،
جو بیمار پانی کی جِلد کے نیچے
فاسد ذرّوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں،
شمار کرتا رہتا ہے
میرے بھائی کو فلسفے کی لت پڑ گئی ہے

میرا بھائی باغیچے کی شفا کو
اس کے انہدام ہی سے ممکن سمجھتا ہے
وہ نشے میں آ کر
درودیوار پر مکّے مارتا ہے
اور سعی کرتا ہے کہ کہے
کہ وہ نہایت دردمند و خستہ و مایوس ہے
وہ اپنی ناامیدی کو بھی
اپنے شناختی کارڈ اور جیبی کیلنڈر
رومال اور سگریٹ لائٹر
اور بال پوائنٹ قلم کی طرح
کوچہ و بازار میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے
اور اس کی ناامیدی اس قدر چھوٹی ہے کہ ہر رات
مے کدے کے ازدحام میں گم ہو جاتی ہے

اور میری بہن جو پھولوں کی دوست تھی
اور اپنے دل کے سادہ لفظوں کو،
جب ماں اُسے طمانچہ مارتی تھی،
اُن کی مہربان و خموش رفاقت کے لیے لے جاتی تھی
اور کبھی کبھی مچھلیوں کے خاندان کی
سورج اور مٹھائی سے ضیافت کرتی تھی
اس کا گھر شہر کے دوسری طرف ہے
اور وہ اپنے مصنوعی گھر میں
مصنوعی سُرخ مچھلیوں کے ساتھ

اور اپنے مصنوعی شوہر کی پناہ میں
مصنوعی سیب کے درختوں کی شاخوں کے نیچے
مصنوعی گانا گاتی رہتی ہے
اور اصلی بچے پیدا کرتی رہتی ہے

وہ
جب بھی ہم سے ملنے آتی ہے
اور اس کے دامن کا گوشہ
باغ کی مفلسی سے آلودہ ہو جاتا ہے
یوڈی کلون سے غسل کرتی ہے

وہ
جب بھی ہم سے ملنے آتی ہے
حمل سے ہوتی ہے
ہمارے گھر کا آنگن تنہا ہے
ہمارے گھر کا آنگن تنہا ہے

دن بھر
عقب سے کسی چیز کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی
آواز آتی رہتی ہے
اور دھماکوں کی آواز
ہمارے سارے ہمسائے
اپنے باغ میں پھولوں کی جگہ
بم اور مشین گنیں بوتے ہیں
ہمارے سارے ہمسائے اپنے حوضوں پر

سر پوش ڈھک دیتے ہیں
اور ان کے ٹائلیں لگے حوض
خود بخود
بارودی ڈھیروں کے خفیہ گودام بن جاتے ہیں
اور ہماری گلی کے بچوں نے
اپنے بستوں میں چھوٹے چھوٹے بم بھر رکھے ہیں
ہمارے گھر کا آنگن اُلجھن میں پڑا ہوا ہے
میں اس وقت سے ڈرتی ہوں
جس نے اپنا دل گم کر دیا ہو،
اور ان تمام ہاتھوں کے ناکارہ پن سے

اور ان تمام چہروں پر بے گانگی سے ڈرتی ہوں
میں اس طالبِ علم کی طرح،
جو ریاضی کے سبق سے
دیوانہ وار محبت کرتا ہو، تنہا ہوں
اور سوچتی ہوں کہ باغیچے کو اسپتال بھیجنا چاہیے
میں سوچتی ہوں...
میں سوچتی ہوں...
میں سوچتی ہوں...
اور دھوپ میں باغیچے کے دل پر وَرم آ گیا ہے
اور باغیچے کا جو ذہن تھا، رفتہ رفتہ
سبز یادوں سے تہی ہوتا جا رہا ہے

کوئی آ رہا ہے

میں نے خواب دیکھا ہے کہ کوئی آ رہا ہے
میں نے خواب میں ایک قرمزی ستارہ دیکھا ہے
اور میری پلک پھڑکتی رہتی ہے
اور میرے جوتے پر جوتا چڑھ جاتا ہے
میں اندھی ہو جاؤں
اگر جھوٹ بولوں

اس قرمزی ستارے کا خواب
میں نے اُس وقت دیکھا ہے جب میں سو نہیں رہی تھی
کوئی آ رہا ہے
کوئی آ رہا ہے
کوئی دوسرا
کوئی بہتر
کوئی جو کسی جیسا بھی نہیں
انسی جیسا نہیں
یحییٰ جیسا نہیں
ماں جیسا نہیں
وہ ویسا ہے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا
اور اس کا قد معمار کے گھر کے درختوں سے بلند تر ہے

اور اس کی صورت
امامِ زماں کی صورت سے روشن تر
اور سیّد جواد کے بھائی سے بھی وہ نہیں ڈرتا
جس نے جا کر
پولیس کی وردی پہن لی ہے
اور سیّد جواد تک سے، کہ ہمارے گھر کے تمام کمرے
جس کا مال ہیں، نہیں ڈرتا
اور اس کا نام ایسا ہے جیسا میری ماں
نماز کے آغاز میں لیتی ہے
اور انجام میں
یا وہ قاضی القضات ہے
یا وہ حاجی الحاجات ہے
اور وہ پڑھ سکتا ہے
تیسری جماعت کی کتاب کے
سارے مشکل لفظ
آنکھیں بند کر کے
اور نفی کر سکتا ہے بیس ملین سے ہزار کی
کمی پڑے بغیر
اور اُدھار خرید سکتا ہے جتنا چاہے
سیّد جواد کی دکان سے
اور وہ ایسا کام کر سکتا ہے
کہ "اللہ" کا لیمپ،

جو سبز تھا، مانندِ صبحِ سحر سبز تھا
مسجدِ مفتاحیان کے آسمان پر
دوبارہ روشن ہو جائے
اُف...
روشنی کس قدر اچھی ہے
روشنی کس قدر اچھی ہے
اور میں کس قدر چاہتی ہوں کہ
یحییٰ کے پاس ایک چھکڑا ہوتا
اور ایک چھوٹی سی لالٹین
اور میرا دل کتنا چاہتا ہے
یحییٰ کے چھکڑے پر تربوز اور خربوزوں
کے ڈھیر پر بیٹھ کر
میدانِ محمدیہ میں سواری کروں
اُف...
میدانِ محمدیہ میں چکر لگانا کتنا بھلا ہے
اور چھت پر سونا کتنا بھلا ہے
اور باغِ ملّی میں سیر کرنا کتنا بھلا ہے
اور پیپسی کا مزہ کتنا بھلا ہے
اور فردین کے سنیما کتنے بھلے ہیں
اور ان سب اچھی چیزوں سے میں کس قدر خوش ہوتی ہوں
اور میرا دل کتنا چاہتا ہے
کہ سیّد جواد کی بیٹی کے بال پکڑ کر کھینچوں

میں اتنی چھوٹی کیوں ہوں
کہ سڑکوں پر کھو جاؤں؟
اور ابا اتنے چھوٹے کیوں نہیں
کہ سڑکوں پر کبھی نہ کھوئیں؟
اور وہ ایسا کوئی کام کیوں نہیں کرتے
کہ وہ، جسے میں نے خواب میں دیکھا ہے،
ذرا جلد آ جائے
اور قصاب خانے کے پڑوس میں لوگ ــــــ
جن کے باغیچوں کی خاک خونم خون ہے
اور حوضوں کا پانی بھی خونم خون ہے
اور جوتوں کے تلے بھی خونم خون ہیں ــــــ
ایسا کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟
ایسا کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟
سرما کا آفتاب کس قدر کاہل ہے
میں نے چھت کی سیڑھیوں پر جھاڑو دی ہے
اور کھڑکیوں کے شیشوں کو بھی دھویا ہے
ابا کیوں صرف سوتے میں خواب دیکھ سکتے ہیں؟
میں نے چھت کی سیڑھیوں پر جھاڑو دی ہے
اور کھڑکیوں کے شیشوں کو بھی دھویا ہے

کوئی آ رہا ہے
کوئی آ رہا ہے

کوئی، جو اپنے دل میں ہمارے ساتھ ہے، اپنے سانسوں میں
ہمارے ساتھ ہے، اپنی صداؤں میں ہمارے ساتھ ہے
کوئی ــــ جس کی آمد کو روکا نہیں جا سکتا
جسے ہاتھ باندھ کر زنداں میں نہیں پھینکا جا سکتا
کوئی، جو یحییٰ کے پھٹے پرانے کپڑوں کے نیچے
پیدا ہوا ہے
اور روز بہ روز
بڑا ہوتا جا رہا ہے،
اور بھی بڑا...
کوئی، بارش میں سے، بارش کی جھر جھر میں سے،
اور اطلسی پھولوں کی سرگوشیوں میں سے،
توپ خانے کے آسمان میں سے
آتش بازی کی رات کو آ رہا ہے
اور دستر خوان بچھا رہا ہے
اور روٹی کو تقسیم کر رہا ہے
اور پیپسی کو تقسیم کر رہا ہے
اور باغِ ملّی کو تقسیم کر رہا ہے
اور کالی کھانسی کے شربت کو تقسیم کر رہا ہے
اور ناموں کے اندراج کو تقسیم کر رہا ہے
اور اسپتال کے بستروں کے نمبروں کو تقسیم کر رہا ہے
اور ربڑ کے بوٹوں کو تقسیم کر رہا ہے
اور فردین کی فلموں کو تقسیم کر رہا ہے

اور سیّد جواد کے بیٹی کے درختوں کو تقسیم کر رہا ہے
اور جو کچھ نہ بِک سکا اُسے تقسیم کر رہا ہے
اور ہمیں بھی ہمارا حصّہ دے رہا ہے

میں نے خواب دیکھا ہے...

صرف صدا رہ جائے گی

میں کیوں رکوں، کیوں؟
پرندے اپنی جستجو میں نیلی سمت جا چکے
اُفق عمودی ہے
اُفق عمودی ہے اور حرکت فوارہ وار
اور حدِ نگاہ تک
نورانی سیارے گردش کر رہے ہیں
زمیں اپنی بلندی میں تکرار تک پہنچ رہی ہے
اور ہوائی کنویں
رابطے کی سرنگوں میں تبدیل ہو رہے ہیں
اور دن ایسی وسعت ہے
جو اخباری کیڑوں کے تصور میں نہیں سما سکتی

میں کیوں رکوں؟
راستہ حیات کی باریک رگوں کے درمیان سے گزرتا ہے
چاند کی کوکھ کی کشتی پر محیط کیفیت
فاسد ذرّوں کو ہلاک کر دے گی
اور کیمیائی فضا میں، طلوع کے بعد
صرف صدا ہے جو باقی رہ جائے گی
میں کیوں رکوں؟

دلدل آخر کیا بن سکتی ہے؟
کیا؟ بجز حشراتِ فساد کی تخم ریزی کی آماج گاہ کے؟

سرد خانے کے افکار کو چھوتے ہوئے جنازے رقم کرتے ہیں

نامرد نے سیاہی میں
اپنے مردمی کے فقدان کو چھپا دیا ہے
اور بھنگا... آہ!
جس وقت بھنگا بات کرنا شروع کرتا ہے!
میں کیوں رکوں؟
سیسے کے حروف سے ہم کاری لغو ہے
سیسے کے حروف سے ہم کاری
گھٹیا خیال کو نجات نہیں دلائے گی
میں درختوں کے خاندان سے ہوں
گھٹی ہوئی ہوا کا تنفس مجھے ملول کرتا ہے
ایک مُردہ پرندے نے مجھے نصیحت کی کہ میں
پرواز کو یادوں کے حوالے کر دوں

ہر فتح مندی کی انتہا پیوستگی ہے
سورج کی روشنی کے اصول سے پیوستگی.
اور شعورِ نور کے ساتھ برسنا

یہ فطری بات ہے
کہ پون چکیاں گل جاتی ہیں
میں کیوں رکوں؟
میں نے کچے گندم کے خوشوں کو
اپنے پستانوں کے ساتھ چمٹا لیا ہے
اور انہیں دودھ پلا رہی ہوں

صدا، صدا، صرف صدا
پانی کی جاری ہونے کی شفاف خواہش کی صدا
خاک کی دیوار نسائیت پر ستاروں کی ریزشِ نور کی صدا
اور معنی کے نطفے کے انعقاد کی صدا
اور عشق کے ذہنِ مشترک کی وسعت
صدا، صدا، صدا... صرف صدا باقی رہ جائے گی

کوتاہ قدوں کی سرزمین پر
پرکھنے کے معیار
ہمیشہ صفر کے مدار پر سفر کرتے ہیں
میں کیوں رکوں؟
میں چہار گانہ عناصر کی اطاعت کرتی ہوں
اور میرے دل کے نظام نامے کی تدوین
اندھوں کے محلے کی حکومت کا کام نہیں

حیوان کے عضوِ جنسی میں
متوحش طویل چنگھاڑ سے مجھے کیا واسطہ؟
گوشت کے خلا میں کیڑے کی حقیر حرکت سے مجھے کیا واسطہ؟
زندگی سے میرا عہد تبِ خونِ گل سے ہے
تبِ خونِ گل سمجھتے ہو؟

میں دل گرفتہ ہوں

میں دل گرفتہ ہوں
میں دل گرفتہ ہوں

میں جھروکے سے جا رہی ہوں
اپنی انگلی رات کی کشیدہ جِلد پر کھینچتی ہوئی

رابطے کے چراغ تاریک ہیں
رابطے کے چراغ تاریک ہیں

کوئی سورج سے میرا
تعارف نہیں کرائے گا
کوئی مجھے چڑیوں کے گھر مہمان نہیں لے جائے گا
پرواز کو یادوں کے حوالے کر دو
پرندے مر جاتے ہیں

آج اس مقام پر
دن کے اختتام پر
سوچتی ہوں کوئی ہے اگر کہیں
ہے کہیں...
آہ کیسی گونج اس کہیں میں ہے!
جیسے آرزوئے "ہاں" کی نوک پر "نہیں" میں ہے

ہے اگر کہیں کوئی
مختلف ہے سب تصورات سے
قادر ایک شے پہ بھی نہیں ہے وہ
علت و سبب سے، قوت و تعد سے ماورا
ایک مادۂ جوان و حاملہ کی مثل ہے
بے پناہ بے دفاع
شاید اک جمال ہے
شاید ایک عشق ہے
شاید ایک حال ہے گزر کرے دلوں سے جو
شاید ایک سیلِ اشک
تیرے شعر پڑھ کے میری چشم سے جو ہے رواں

آج اس مقام پر
دن کے اختتام پر
سوچتی ہوں کتنے روز تجھ سے ہم کلام تھی
بند تیرے ساتھ اک مکان میں
کس طرح اڑا کے لے گئی تھی میری نیند تو!
کس نے دے دیا تھا تجھ کو میرے دل پہ اختیار
تو اسیرِ مردِ پُر غرور میں تری اسیر
تیرے عشق، تیرے وصل و ہجر میں شریک تھی
آخر ایک مقام پر
دن کے اختتام پر
حسن و خیر و شعر صرف آنسوؤں میں ڈھل گئے

الوداع
اب نہ مجھ کو یاد آ
اب نہ میرے ساتھ چل
اب نہ میرے دل پہ ڈال اپنا سایہ ارغواں

کوئی ہے اگر کہیں...
گونج اس "کہیں" میں ہے
جیسے سن رہی ہے تو...
سن رہی ہے یا نہیں...!!!

فہمیدہ

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: +92- 334 0120123

Muslim Women Writers Series

The Muslim Women Writers Series of WADA, the women's press aims at bringing to the reader the thoughts and sensibilities of contemporary Muslim female intelligentsia... courageous and steadfast in its pursuit of peace, beauty, equality and freedom for all humankind.

About this book

"Through An Open Window" is the translation of the poems by the great Iranian woman poet **Forough Farrukhzad.** She was the most outstanding literary figure to emerge in the Muslim World towards the middle of the twentieth century. The poems have been translated into Urdu by **Fahmida Riaz**, a well-known Urdu poet. The translation coveys to the reader much of the music and beauty of the original as well as the uninhibited expression of Forugh Farrukhzad. This volume contains selections from all five volumes of poems by Farugh, and is representative of her entire work.

WADA (Women & development Association) is a women's publishing house. It is a registered NGO striving for partnership with development organisations.

WADA KITAB GHAR: 141-D, Block - II, P.E.C.H.S, Karachi-75400, Tel: 4537941